رقصِ آگہی

جاوید شیدا

پاک دھرتی کا زندۂ جاوید شاعر

جاوید شیدا دُنیائے ادب کا ایک روشن ستارہ اس لئے ہے کہ اس نے اپنی زندگی ادب کے لئے وقف کی ہوئی ہے، وہ شاعر بھی ،ادیب بھی ، ڈرامہ نگار بھی ، افسانہ نگار بھی، ناول نگار بھی تجزیہ نگار بھی اور سکالر بھی ہے۔ اسکی گرفت اردو اور پنجابی زبان پر اسقدر مظبوط ہے کہ جب چاہے جس موضوع پر چاہے وہ آسانی سے شعر کہہ لیتا ہے یہ خوبی پہلے شاعروں میں بہت تھی، اب کم ہوگئی ہے، وہ پھولوں میں رہنے والا آدمی ہے سبز پتوں پر گرتی ہوئی شبنم کے قطروں سے شعر کے فانوس روشن کرتا ہے، سحر کے دلفریب منظر، آبشاروں کا حُسن روپہلی کرنوں سے پھوٹتی ہوئی شفق سے وہ اپنے شعروں کو سجاتا ہے، روانی ایسی کہ جیسے شعر میں نثر پڑھ رہا ہے اِسے ایسا محکمہ سونپا گیا تھا جس میں باغوں کا حُسن اِسکی آنکھوں کی چلمن پر مہرِ تاباں کی طرح جگمگا رہا تھا وہ باہمت شاعر جس نے حادثات کا سامنا بھی کیا کٹھن منزلوں سے بھی گزرا، زمانے کی اونچ نیچ کا بھی سامنا کیا، اپنے دکھ کسی کو نہیں بتائے مگر دوسروں کے دکھ بانٹنا عبادت سمجھتا ہے۔ قدرت نے جاوید شیدا کو ان گنت صلاحیتوں سے نواز ہے اور اِس نے اُسکا بڑا فائدہ اُٹھایا ہے اِس کی شاعری اِسکی گواہ ہے مذکورہ کتاب اِسکی پہلی کتاب نہیں اِس سے پہلے بھی وہ اردو پنجابی کی کئی کُتب اہل ذُوق کی نظر کر چکا ہے میں حیران ہوں کہ طویل عرصہ سے بین الاقوامی جشن بہاراں کی صورت ادب اور ثقافت کی بے پناہ خدمات کے باوجود آج تک قومی صدارتی ایوارڈ سے محروم کیوں ہے! میں جاوید شیدا کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اتنے گھمبیر مسائل کے باوجود اس نے ادب کی قندیل روشن کی ہوئی ہے۔

اقبال راہی

تحفہ برائے چغتائی پبلک لائبریری لاہور

بصد خلوص

۱۵/۱/۲۰۲۳

رقصِ آگہی

(اردو غزلیات)

جاوید شیدآ

بسم الله الرحمن الرحيم

ضابطہ

تمام حقوق اُس کے، جس نے الفاظ عطا کیے

کتاب: رقصِ آگہی

شاعر: جاوید شیدؔا

حرفِ شکر: بنام والدین

ناشران: حِسان جاوید چوہدری، ریان علی، محمد ہرسم ارغوان چوہدری

سرِ ورق: کرن ارغوان، عبیغہ جاوید

اشاعتِ اول: ۲۷ ستمبر ۲۰۲۱

تعداد: ۱۰۰۰

پبلشر: ارغوان پبلیکیشنز ۔ فون: ۸۰۳۰۸۷۵۔۰۳۰۰۔۹۲+

قیمت: ۵۰۰ روپے (10 امریکی ڈالر)

ای میل: jawaidshaida@gmail.com

اِنتساب

اُن لمحات کے نام جب لوگ اَشکوں کے دِیپ جلائے ہمیں ڈھونڈتے پھریں گے!

فہرست

جاوید شیدؔا مسافرِ دشتِ آ گہی ۱۰
شاعروں میں افسر... افسروں میں درویش ۱۳
حقیقت کا شاعر ۱۵
یہی ہے حقیقت یہاں بھی وہاں بھی ۱۶
تُو آلِ نبی اولادِ علی ۱۷
ہے نظر سُوئے مدینہ لب پہ اُن کا نام ہے ۱۸
امکان پر کھلا جو ذرا رقصِ آ گہی ۱۹
رہنے دے موجِ فن کو بنائے چمن نہ کھینچ ۲۰
ہر نفس اپنی طلب میں یُوں سی کی روشنی ۲۱
سر پھری آندھیاں دالان سمیت ۲۲
چشمِ جہاں میں گرچہ کشادہ نہیں رہا ۲۳
کچھ تو یاد کروائے صاحب ۲۴
ضبط کے ماسِوا چارہ نہیں ۲۵
سمجھا ہوں جب سے تختِ شہی کے مزاج ۲۶
جس نے ہر ایک تازہ تمنا شہید کی ۲۷
ہم نے اکثر زوال کے پل میں ۲۸
حسرتِ شوق بدگمان نکال ۲۹
داغ کوئی مری نظر میں نہ تھا ۳۰
صورتِ حرفِ رائیگاں نہ ہُوا ۳۱
کون کرے اندازہ غم کا ۳۲
خوف رگوں میں بھر جاتے ہیں ۳۳
قبل ابتدائے محبت ۳۴
شعر کہنے سے بدگماں بھی نہیں ۳۶
اور اب یہی ہمیں اکثر گُماں گزر جائے ۳۷
لمحہ لمحہ غمِ دنیا سے گزرتا ہوا دل ۳۸
دلِ تُو ایسے شکستہ جان نہ ہو ۳۹
تشنہ لبوں کو ساقیا تعبیر خواب دے ۴۱
رستہ طویل تر تھا تکمیل آرزُو کا ۴۲
ہو بھی سکتا ہے اگر ہو جائے ۴۳
دل پہ گرچہ اثر بھی ہوتا ہے ۴۴

اب کے حالات یوُں بنے ہُوئے ہیں ۴۵
وہ زمیں ہو کہ آسماں کوئی ۴۶
قدم اُلٹے بھی پڑنے لگے ہیں ۴۷
میں جس دن سے ٹھکانے لگ گیا ہوں ۴۸
ابتدا اپنی، انتہا اپنی ۴۹
لمحہ لمحہ جیون سے بے زار رہا ۵۰
بھڑاس ایسے دلوں کی نکالتے ہیں ہم ۵۱
طلب کہ آمادۂ سفر تھی ۵۲
دل کی باتیں اُنہیں سُنائیں کیا ۵۳
زخم تازہ، دردِ دل، تنہائیاں ۵۴
چھوڑ کر دُنیا کا مسکن لوٹ کر جانا پڑا ۵۵
شک کی نظر سے دیکھا، زمانے نے شک کیا ۵۶
میں دربدر رہا ہاتھوں پہ اپنی جان لیے ۵۷
جب دھڑکن مجذوب ہوئی ۵۸
شوقِ نظارہ سنورنے کا نہیں ۵۹
اندیشہ ہائے تنگیٔ داماں بھی چھوڑ دے ۶۰
کھو نہ جائے ذات کا محور کہیں ۶۱
ہے تعلق اس قدر تحریر سے ۶۲
لوگ اتنے بھی پیارے لگتے ہیں ۶۳
جب سے آئی وصال یار کی رات ۶۴
آؤ کچھ تو پیار کی باتیں کریں ۶۵
نہ مانگی روشنی پھر بھی جہاں سے ۶۶
ہر نفس گرچہ اختلاف کیا ۶۷
یہ سماعت جدھر لگا دی ہے ۶۸
مِٹی کی مِثل آس کا مہتاب کر دیا ۶۹
شہر گمنامی میں جب شہرت کا دروازہ لگا ۷۰
ٹھوکر لگی ہمیشہ، اکثر فریب کھائے ۷۱
گُماں نے ایسے شکست دی ہے ۷۲
کچھاں لیے بھی دل و نظر میں عجب دہائی پڑی ہوئی ہے ۷۳
دُنیا سے پھر بھی مجھ کو محبت نہیں رہی ۷۴
جیسے اب ہیں یوُں خدوخال نہ تھے ۷۵
پتھر ہوئی تمنا، اُلٹا ہوا ستارا ۷۶
ایسے غم حالات کی تحریر بنائی ۷۷
چھا گیا ہر سُو بڑھاپا سا، جوانی کیا ہُوئی ۷۸
اِک کائی رنج و غم کی رہتی ہے بام و در پر ۷۹
سفرِ دشتِ ہنر سے ہو آیا ۸۰

تیرہ بختوں کو خبر کیا ہے، اُجالا کیا ہے ۸۱
یہ خرابی مرے سبب میں ہے ۸۲
اُس کی ذات کو جان لیا ۸۳
جب سے ڈالی نئے لہو کی طرح ۸۴
لے کے دامن میں رحتِ حیات ۸۵
آؤ ذرا اب کُھل کے یارو رو لیتے ہیں ۸۶
پاؤں سے اُنکی گلی کا راستا باندھے ہوئے ۸۷
صرف اک انتظار باقی ہے ۸۸
چاند اُترا ہے جب سے پانی میں ۸۹
جو ہے دِل میں لبوں پر اُسے لا سکوں ۹۰
اپنے محور سے کٹ رہی ہے حیات ۹۱
آدمی جن کو کم سمجھتے ہیں ۹۲
کی ہے جب بھی کبھی چمن کی بات ۹۳
ستارہ جب مرا ہمدم ہوا ہے ۹۴
ٹہنی ٹہنی غنچہ، کھلنا ہوتا ہے ۹۵
آجکل دل یُوں تیری یاد میں ہے ۹۶
گردشِ خوں بھی ہے بدن میں اُداس ۹۷
روگ ٹھہرا سخن برائی کا ۹۸
صُورت آئینہ ٹوٹ جاتا ہوں ۹۹
کبھی ایسی خطا نہیں کرتے ۱۰۰
لاکھ چاہو مگر نہیں آتا ۱۰۱
زمانہ یُوں ستم گر ہو گیا ہے ۱۰۲
اِس قدر دھیان میں دامن کی ہواؤ رکھنا ۱۰۳
خبر نہ تھی وہ مجھے یوں بھی آزمائے گا ۱۰۴
یہ ہے کردار زمانہ والا ۱۰۵
جو تری آرزو میں جلتے ہیں ۱۰۶
دل نے یونہی نہیں دہائی کی ۱۰۷
ایسے بگڑی ہوئی تقدیر بنائی ہوئی ہے ۱۰۸
ایک ایسا خیال آنکھ میں ہے ۱۰۹
ہو کے مجبور زندگانی سے ۱۱۰
یہ حادثہ بھی سر رہ گزار ہونا تھا ۱۱۱
عجب اِک خوف سا پھیلا ہوا ہے ۱۱۲
وہ قریبی تھا، اب بس قریب ہے ۱۱۳
لاکھ وہ مجھ سے بدگمان رہا ۱۱۴
آنکھیں نہیں مِلتیں کبھی چہرہ نہیں ملتا ۱۱۵
لمحہ لمحہ پلک پلک تازہ ۱۱۶

بپا ہے حشر سا اِک آسمان پر	۱۱۷	کوئی صُورت اب بہر صورت بنانا چاہیے	۱۳۷
جِس دن سے روبرو ترا چہرہ نہیں ہوا	۱۱۸	خود کو گرتے ہوئے سنبھالا جائے	۱۳۸
گمان یونہی نہیں ہے خیال یونہی نہیں	۱۱۹	بات جو پیار کی سمجھتے ہیں	۱۳۹
تلخ جینے کا وں حصول کیا	۱۲۰	داستاں ایسی اب رقم کر دیں	۱۴۰
دل کم بخت کی نادانی سے	۱۲۱	اب یہی دِل میں ایک ٹھانی ہے	۱۴۱
دھوپ دنیا کو مگر لگتا ہے	۱۲۲	بے وفا ایک دن یہ ہونا ہے	۱۴۲
جب تری آرزو کو مار لیا	۱۲۳	مُونس و غم گُسار ہیں میرے	۱۴۳
خامشی کو زباں نہیں پایا	۱۲۴	بے خبری میں بھی، خبر تو ہے	۱۴۴
یہ بھی نہیں کہ مجھ کو خسارا نہیں ہوا	۱۲۵	اب کے وہ حشر ہم اُٹھا دیں گے	۱۴۵
روز و شب ہاتھ پاؤں مارتا ہوں	۱۲۶	اب کے یوں اپنا سر اُٹھا کے چلیں	۱۴۶
کبھی تھا اب مگر ایسا نہیں ہے	۱۲۷	کیا کہوں کیسا عہد میرا ہے	۱۴۷
مناظر سے لہو جاری نہیں تھا	۱۲۸	وہ نہ آئے تو اُن کی یاد آئی	۱۴۸
دکھائی دیتے ہیں کانٹے بھی پھول دامن کے	۱۲۹	اے مرے شاہا ترے دربار میں	۱۴۹
یہ روشنی ترے غم کی گنوا نہیں سکتا	۱۳۰	زخم سینے کے جبینوں پہ عیاں ہونے میں	۱۵۰
فصیلِ شام پر آنکھیں سجا کر	۱۳۱	بعد از ہجر بھی جُدا نہ ہوا	۱۵۱
پھول سے خار کی مانند بنایا ہے مجھے	۱۳۲	دشتِ حسرت گزار آئے ہم	۱۵۲
جب تک کہ اِس کی زلف سنواری نہ جائے گی	۱۳۳	کھویا ہے اُس نے مجھ کو کسی اور کے لیے	۱۵۴
چلتا ہوں میں جو تھام کے خوابوں کی روشنی	۱۳۴	وہ جو حرف حرف اُجال دے	۱۵۵
ہمیشہ ضبط کو میں ایسے آزماتا ہوں	۱۳۵	عشق کہانی بہت پرانی	۱۵۶
ہوا ادا ہم سے باوضو آمین	۱۳۶		

جاوید شیدؔا مسافرِ دشتِ آ گہی

جب انسان زندگی اور موت کے درمیانی فاصلوں کو طے کرنے کی مسافت پر چل پڑے تو خود کو آ گہی کے لامتناعی سلسلوں پر پھیلی خلاؤں میں دیکھتا ہے اور جیسے جیسے وہ شعور کی منزلیں سر کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو وہ سفرِ آ گہی کا مسافر بن جاتا ہے مگر انسان کو آ گہی یونہی نہیں مِل جاتی، جہاں اُس کو خود کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے وہاں اُسے تمدنی درستگی بھی مقصود ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے معاشرے اور تہذیب و تمدن سے بھی جڑا ہوتا ہے اور پھر جب اِن دونوں راستوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا وقت آتا ہے تو اُس کے اندر آ گہی دھمال ڈالنا شروع ہو جاتی ہے اور بس یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں رقص آ گہی شروع ہو جاتا ہے۔

جاوید شیدؔا کی شعری تصنیف ''رقص آ گہی'' اپنی ابتدا سے ہی اپنے قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے ان کی حمد و نعت اور منقبت کی شاعری تو اس بات کا واضح ثبوت ہے وہاں ان کی پہلی غزل کے یہ دو اشعار ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح اس دھمال میں بھی ان کا شعور ان کی راہیں روشن رکھتا ہے

؎ فرصت نہیں ہے ایک بھی لمحہ دھمال سے
جب سے ہوا ہے مجھ کو عطا رقصِ آ گہی
؎ چشم جہاں میں گرچہ کشادہ نہیں رہا
میں تیری آرزو سے زیادہ نہیں رہا

جناب جاوید شیدؔا کا تعلق تقسیم پاک و ہند کے ایک انتہائی قابل قدر اور معتبر علمی ادبی خانوادے سے ہے۔ ان کے والد گرامی چودھری ایم اے شیدؔا قیامِ پاکستان کی تحریک کے اولین مجاہدوں میں شمار ہوتے تھے اور قائداعظم کے قریبی ساتھی ہو قبل تقسیمِ ہند ہی مجاہد پاکستان کے خطاب سے نوازے گئے تھے اور یوں جاوید شیدؔا اسلام سے محبت اور پاکستانیت کی گھڑتی لے کر اس جہانِ آب و گل میں تشریف لائے اور انہوں نے اپنے والدِ

گرامی قدر کے رفقائے عظیم سید عبدالحمید عدم، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، سید نقشؔ ہاشمی، اختر رومانیؔ، شاہد چاند پوری، سید عابد علی عابدؔ، منیر نیازی، سید وقار عظیم، طفیل ہوشیار پوری، پروفیسر عبدالحمید کوثر اور سرور مجازؔ کی علمی اور ادبی محفلوں سے فیض یاب ہو کر خود ایک اعلیٰ ادبی مقام پر فائز ہوئے۔ ...... ابتدائی زندگی میں ہی 7 برس کی عمر میں قرآن ناظرہ مخارج اور کتابت کے فن پر دسترس حاصل کی، اس کے بعد ان کا کتاب اور قلم سے ایسا رشتہ اُستوار ہوا جو آج تک غالب ہے اور یہی رشتہ ان کو روحانی کھوج کی طرف لے چلا۔ حضرت پیر مہر علی شاہؒ کا دستِ شفقت اور پیر نصیر الدین شاہ صاحب سے ذاتی دوستی نے روحانیت کی طلب کو مزید بڑھاوا دیا۔ شاعری کے میدان میں 1973ء میں ان کی پہلی غزل ماہنامہ تخلیق کی زینت بنی اور پھر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، روزنامے ہفت روزہ، ماہنامہ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم کون سا میدان ہے جو انہوں نے سر نہیں کیا۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ان کا پہلا افسانہ ''خاموش محبت'' اس وقت شہزادہ عالمگیر نے شائع کیا۔ ان سے میرا پہلا تعارف بھی 70 کی دہائی میں ہوا جب کہ انہوں نے لاہور کے باغات میں مشاعروں کی طرح ڈالی اور یوں باغ جناح میں ہونے والے پہلے آل پاکستان اوپن ایئر مشاعرے میں مجھ ناچیز کو بھی شامل ہونے کی دعوت ملی اس کے بعد 1978ء میں قیام پاکستان کے حوالے سے ایک کل پاکستان مشاعرہ حضرت نقشؔ ہاشمی کی اقامت گاہ المعروف ہاشمی لاج میں جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں 20 ویں اور 21 ویں صدی کے ممتاز اور نامور شعرا کرام نے شرکت کی اور جاوید شیداؔ جناب احمد ندیم قاسمیؔ، خالد احمد اور نجیب احمد کی ہمراہی میں ہاشمی لاج پہنچے جہاں ہاشمی لاج کی تاریخ کا بہت بڑا مشاعرہ تھا جس نے عالمی شہرت حاصل کی جاوید شیداؔ کا تعارف لکھتا جاؤں تو قلم رکنے کا نام نہ لے مگر اس طرح میں ان کے فنی اوصاف کے حوالے سے جو باتیں مزید قارین کے گوش گزار کرنا چاہوں گا وہ کشتہ لب رہ جائیں گی بعد ازاں ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے بین الاقوامی جشن بہاراں کے انعقاد کے ذریعے ادب و ثقافت کی ترویج، ناصر باغ میں شعرا و باء کیلئے چوپال اور الحمرہ آرٹس کونسل میں ادبی بیٹھک کا قیام بھی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

جاوید شیداؔ کی شخصیت بھی ان کی اقلیم علم و ہنر کی طرح ہی نہ صرف کشش امیز وُسعت رکھتی ہے بلکہ ان کی شاعری قارین کو حیرت انگیز فکر و نظر کی وادیوں کی طرف دھکیلتی نظر آتی ہے انہوں نے الفاظ و معانی کے جو اعلیٰ معیارات اپنی شاعری میں متعین کئے ہیں وہ ان کی اپنے معاشرے میں پھیلی ہوئی زمینی حقیقتوں سے نہ صرف جڑے ہوئے ہیں بلکہ ان کی فکری اور قلمی مہارت و کمال کی آئینہ دار ہے ان کے بہت سے اشعار جو اظہار میں انتہائی سادہ سے لگتے ہیں مگر اُن میں بھی ایک خاص قسم کی دمک اور مہک محسوس ہوتی ہے انہوں نے اپنے خیالات کو جس شائستگی اور شگفتگی کے ساتھ اظہار و ابلاغ کی فکر انگیزیوں سے سجایا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ دراصل کسی فن میں دسترس مہارت، لگن اور مطالعہ جہاں محنت و ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے وہاں طبیعت کا قدرتی میلان بھی اہم درجہ رکھتا ہے اور جاوید شیداؔ "رقص آ گہی" کی اس تصنیف میں اس بات سے بخوبی آ گاہ ہیں ان کا یہ شعر اس بات کی واضح دلیل ہے۔

رات بھر خون جلانا پڑتا ہے
دیپ ایسے جلا نہیں کرتے

اخترؔ ہاشمی
ہاشمی لاج مرید کے

شاعروں میں افسر...... افسروں میں درویش

رقص آگہی...... کا شاعر جاوید شیدا۔۔ نصف صدی قبل سے لاہور میں ہے...... اس نے لاہور میں بہت سے تاریخی مشاعرے کروائے...... ایک بہترین منتظم کی طرح سٹیج کی آرائش سے لے کر شاعروں کی آسائش اور طعام کا خیال رکھا...... سٹیج سیکرٹری کے فرائض نبھاتے ہوئے نہایت خوش اسلوبی سے نظامت کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔

اِن بین الاقوامی مشاعروں میں تمام نامور بڑے ادیب اور شعراء شریک ہوتے سامعین میں بیورو کریسی کے تمام خوش ذوق افسران کا ذوق دیدنی ہوتا۔ خالد احمد، نجیب احمد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کلیان سنگھ کلیان، شہزاد احمد، منیر نیازی، جاوید قریشی، انور مسعود، امجد اسلام امجد، پروفیسر سید خورشید رضوری، پروفیسر حسن عسکری ، پروفیسر ڈاکٹر کامران ، پروفیسر ناہید شاہد، منفعت عباس رضوری، اقبال راہی ،انور مسعود ، کے ہمراہ مجھے بھی ان مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا...... جو شاہی قلعہ لاہور کے عالمگیری گیٹ کے باہر روایتی حضوری باغ، جیلانی پارک کے سبزہ زار اور پھولوں کی نمائش کے درمیان...... باغ جناح کی بارہ دری میں ہر سال منعقد ہوا کرتے تھے۔

جاوید شیدا جو اِن تمام مشاعروں کے کرتا دھرتا تھے اپنی شاعری سے لگن اور ادب سے والہانہ عشق میں سرشار ہو کر کسی ستائش کی تمنا سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے۔

یہ ایسا شاعر ہے جو افسروں کے درمیان شاعروں، ادیبوں کا حقیقی نمائندہ تھا۔ ناصر باغ میں چوپال کا قیام، الحمرا ہال نمبر 3 کے نیچے ادبی بیٹھک بنانے کا خیال اور اس پر عملدرآمد...... لاہور میں پاک ٹی ہاؤس کی خستہ حالی سے بحالی اور پنجابی انسٹیٹیوٹ آف کلچر اینڈ لٹریچر (پلاک) کے معرض وجود میں آنے میں اِن ہی کی کاوشیں ہیں۔ اور پھر ''فیض گھر'' ماڈل ٹاؤن لاہور میں بحیثیت صدر ''ادب سرائے'' میں ماہانہ ادبی نشست کا اجراء اور مقبولیت انہیں کے دم سے تھی۔ اِن کی خوش قسمتی کہ ان کو کامران لاشاری جیسے سرپرست افسر میسر رہے جو نئے خیالات کو نا صرف سراہتے بلکہ ان پر عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر

طرح سے تعاون کرتے...... بین الاقوامی جشن بہاراں بھی جاوید شیدؔا ہی کے زرخیز ذہن کی تجویز اور عملی ذمہ داری رہی۔

ادب اور ادیبوں کی خدمات میں جاوید شیدؔا یہ بھول گیا کہ وہ خود بھی شاعر ہے اور اپنی بے نیازی اور درویشی کے باعثِ اپنی کتابیں چھپوانے میں تاخیر کر دی'' بقول کسے'' ہوئی تاخیرتو کچھ باعث تاخیر بھی تھا...... اور دیر آید درست آید...... اِن کے صوفیانہ پروگرام دیکھنے ملک کے دُور دراز سے باذوق احباب کلام کے انتخاب اوران کی علمی فی البدیع کمپئرنگ سے لطف اندوز ہونے آتے۔

اب سرکاری فرائض سے باحسن ریٹائر ہوکر شاعر اور درویش کو اپنی شاعری پر توجہ دینے کی فرصت میسر ہوئی ہے۔ 2012ء میں ان کی پہلی کتاب نے سب کو حیران کر دیا تھا اور خوب پذیرائی حاصل کی تھی...... اب ان کی تازہ کتاب ''رقص آ گہی'' ہے جس کی شاعری مولانا روم کے رقص درویش جیسی ہے۔ایک درویش نے اِک خاص کیفیت میں یہ اشعار کہے ہیں۔جن کی لذت سے محظوظ ہونے کے لیے ایسی ہی درویشی اور سرشاری درکار ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اردو و پنجابی شاعری پر پی ایچ ڈی مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں، مگر حیرانی ہے کہ حکومت پاکستان تغمہ حسن کارکردگی کے وقت ایسے قابل قدر احباب کی قدر کیوں نہیں کرتی ؟۔

بہت سی دعائیں جاوید شیدؔا کے لیے جو ہمیشہ مجھے برادرِ خورد کی طرح عزیز ہے۔

نیلما ناہید درانی
لندن

حقیقت کا شاعر

یُوں تو ہر اچھا شاعر تلخ سے تلخ بات بھی مصرے میں ڈھال کر مصری کر دیتا ہے مگر آج ''رقصِ آ گہی'' کا مسودہ پڑھنے پر یقین ہوتا ہے کہ عزیزم جاوید شیداؔ میں یہ وَصف بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ زندگی کی چھپی حقیقتوں کو شاعری کے ذریعے قارئین کی نظر میں اس طرح عیاں کر دیتے ہیں کہ معاشرہ اپنے اندر اُن سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں معاشرہ میں راہ پا جانے والے منفی اور استحصالی رویے بھی اِن کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہے۔ کتاب کا عنوان بھی مزاجِ شاعر سے متعارف کروا رہا ہے اِن کے ہاں دُنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہر موڑ پر نظر آتا ہے، آئندہ صدیوں میں آنے والے ادیب و شعراء کی راہیں ہموار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شیداؔ کی غزلیں مختلف موضوعات پر ہیں اور بہت خوب ہیں۔ ان کے ہاں جدید رنگ و آہنگ بھی دکھائی دیتا ہے مگر غزل میں خاص طور پر روایت سے پیوستگی پختہ ہے اور اس روایت سے خاص لگاؤ کا شیداؔ کی شاعری میں ظہور پذیر ہونا ان کی خاص پہچان ہے۔

جاوید شیداؔ کی غزل میں سہلِ ممتنع کی بازیافت بھی نظر آتی ہے۔ لہٰذا شیداؔ کو حقیقت کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

کامران لاشاریؔ

نعت

یہی ہے حقیقت یہاں بھی وہاں بھی
ہے اُنکیؐ نبوّتِ یہاں بھی وہاں بھی

اُنہیؐ تک رہی ہے انہیؐ تک رہے گی
مرے دل کی حسرت یہاں بھی وہاں بھی

وہ حاجت روا ہیں وہ مشکل کشا ہیں
وہی وجہٗ رحمت یہاں بھی
وہاں بھی

اُنہیؐ کی سخاوت اِدھر ہے اُدھر ہے
اُنہیؐ کی سخاوت یہاں بھی وہاں بھی

وہ قرآن ناطق وہ محبوبِ یزداں
بُلند اُنؐ کی قسمت یہاں بھی وہاں بھی

دُرود اُن پہ بھیجو کہ سب سے بڑی ہے
یہی اِک عبادت یہاں بھی وہاں بھی

مرے کام آئے گی جاویدشیدؔا
نبیؐ کی محبت یہاں بھی وہاں بھی

منقبت (بحضور حضرت داتا گنج بخش ؒ)

ٹو آلِ نبی اولادِ علی تو ولیوں میں ممتاز ولی
ہے چرچا تیرا گلی گلی
ٹو ہے اِبنِ عثمان علی

جو تیرے منگتے بنتے ہیں سر فخر سے اُنکے تنتے ہیں
ہر مشکل اُن سے ٹلی ٹلی
ٹو ہے اِبنِ عثمان علی

ٹو بخشے گنج گداؤں کو سُنتا ہے سب کی صداؤں کو
ہر بُری بنائے بھلی بھلی
ٹو ہے ابنِ عثمان علی

ٹو فیضِ عالم داتا ہے میرا بھی تُجھ سے ناطہ ہے
میں خالی جھولی لے کے چلی
ٹو ہے اِبنِ عثمان علی

ٹو غوث بھی ہے ابدال بھی ہے مجبوروں کا لجپال بھی ہے
ٹکڑوں پہ تیرے پلی پلی
ٹو ہے اِبنِ عثمان علی

منقبت (بحضور سید محمد وجیہہ السیما عرفانی ؒ)

ہے نظر سُوئے مدینہ لب پہ اُن کا نام ہے
مرشد کا فیضِ کامرانی ہر قدم ہر گام ہے

میں مُرید اُن کا ہوں وہ جو مُرشدِ کامل میرے
جس طرف نظر اُٹھاؤ لُطف اُن کا عام ہے

ہیں وہی فخر ارادت، ہیں طریقت کے امام
وہ عطائے خواجہ، فکرِ فریدِ بام ہے

مکتبِ عشق و وفا میں آپ سے سیکھا یہ فن
شوقِ وصال کے سِوا یہ زندگی بے نام ہے

میں جو شیدا ہوں زمانے میں ہمیشہ سرخرو
مہربانی اُن کی ہے یہ اُن کا سب اکرام ہے

غزل

اِمکان پر کُھلا جو ذرا رقصِ آ گہی
جاری نفس نفس میں ہُوا رقصِ آ گہی

فرصت نہیں ہے ایک بھی لمحہ دھمال سے
جب سے ہوا ہے مجھ کو عطا رقصِ آ گہی

کھولے ہیں مجھ پہ عشقِ حقیقی کے باب کیا!
تیری ہو خیر، تیرا بھلا رقصِ آ گہی

ورنہ مثالِ سنگ تھی ماتھے پہ میری آنکھ
نُورِ نگاہ تُو نے دیا رقصِ آ گہی

کیسے ادا کروں نہ بھلا تیرا شکریہ
تُجھ سے نشانِ ہستی مِلا رقصِ آ گہی

ورنہ جبینِ شوق بُتوں کی حریص تھی
تُو نے دکھائی راہِ خدا رقصِ آ گہی

شیداؔ کو کوئی شخص مگر جانتا نہ تھا
اب ہر طرف ہے ذِکر مرا رقصِ آ گہی

غزل

رہنے دے موجِ فن کو بنائے چمن نہ کھینچ
اِس دشتِ کم نگاہ میں کارِ سخن نہ کھینچ

سائے ہیں اِن کے جسم کے پیڑوں سے خوشگوار
یہ اہلِ دل ہیں دار پہ، اِن کے بدن نہ کھینچ

دامانِ تار تار کو رہنے دے مُضطرب
کارِ جنوں میں خاروخسِ پیرھن نہ کھینچ

ورنہ نہ آسکے گا کوئی سانس دوسرا
قلب و نظر سے زخمِ وفا کی چُبھن نہ کھینچ

دستِ خزاں کے ہاتھ پہ بیعت نہ کر قبول
ہر شاخِ نوبہار سے سروسمن نہ کھینچ

بزمِ جہاں کو ورنہ اُلٹ دے گی یہ زمیں
خلقِ خدا کے دوست سروں سے گگن نہ کھینچ

شیدؔا کبھی سکُوں کا نہ اِک سانس آئے گا
سینے میں بے وفاؤں کی ہر سُو لگن نہ کھینچ

غزل

ہر نفس اپنی طلب میں یوں سی کی روشنی
اپنے اندر میں جو بیٹھا مسکرائی روشنی

جگمگا اُٹھا میرا سینہ شبِ تاریک میں
اِک ستارے سے اُتر کر ایسی آئی روشنی

جب ہتھیلی پر رکھا میں نے چراغ آگہی
خود فضاؤں میں اُتر کر جیسے آئی روشنی

میں بھٹکتا پھر رہا تھا روشنی میں دربدر
اک اندھیرے نے مجھے آکے سمجھائی روشنی

آگہی کا ایک وہ یارو اُجالا پا گیا
حرف ہائے حرف وہ جس نے کمائی روشنی

پہلے آدم کو بنایا پھر سنوارہ دوستو
اور اُسے محبوب کہہ کے پھر تھمائی روشنی

اپنے من کا تُو جلاکے دیکھ اے شیداؔ دیا
سوچ تُو کِس کام کی ہے یہ پرائی روشنی

غزل

سر پھری آندھیاں دالان سمیت
لے اُڑیں پھولوں کو گُلدان سمیت

تیری حسرت. سے نکل آئی ہیں
آرزوئیں دلِ حیران سمیت

عہدِ بے رنگ میں خوشبو کا گُماں
ہو گیا خاک گلستان سمیت

کارِ بے کار میں اُلجھا ہوا ہے
آدمی فطرتِ انسان سمیت

کام آیا نہ سفر میں کوئی
منزلِ شوق کے سامان سمیت

نقش سب تیرے مِٹا ڈالے
تیری حسرت، ترے ارمان سمیت

سانس لیتا ہُوں میں شیدؔا اب بھی
عشق میں زِیست کے نقصان سمیت

غزل

چشمِ جہاں میں گرچہ کشادہ نہیں رہا
میں تیری آرزو سے زیادہ نہیں رہا

پھیلی ہوئی ہیں موسموں میں بدگمانیاں
کوئی بھی اعتبار کا جادہ نہیں رہا

ملتی نہیں کسی بھی طبیعت میں عاجزی
اب تو کوئی مزاج بھی سادہ نہیں رہا

کیسی گزر رہی ہے پڑوسی سے پوچھ لے
انسان اِس قدر بھی کشادہ نہیں رہا

ہوئی تھی اک خلش جو محبت کی، گُم ہوئی
ہوتا تھا پیار کا جو ارادہ، نہیں رہا

ہوتے تھے سائبان کی صورت کبھی جو لوگ
اُن کے بدن آج لبادہ نہیں رہا

شیدؔا بساطِ زِیست پہ بازی اُلٹ گئی
ہمراہ کوئی شہہ کے پیادہ نہیں رہا

غزل

کچھ تو یاد کرو اے صاحب
سوچ آزاد کرو اے صاحب

پیار کی بستی کو مت ایسے
تم برباد کرو اے صاحب

مِل سکتی ہیں لاکھوں خوشیاں
غم آباد کرو اے صاحب

پیار کی ایک نظر سے میرے
دل کو شاد کرو اے صاحب

رنج و الم کے مارے ہوؤں کی
بس اِمداد کرو اے صاحب

پیڑ اُگاؤ علم کے شیدؔا
حرف ایجاد کرو اے صاحب

غزل

ضبط کے ماسِوا بھی چارہ نہیں
ساتھ دنیا کا بھی گوارہ نہیں

جانتا تھا میں یار لوگوں کو
ڈُوبتے اِس لیے پُکارہ نہیں

سیکڑوں آدمی کے ہوتے ہوئے
آدمی کا کوئی سہارہ نہیں

صاف رکھی نہ آرزو کوئی
کِسی ارمان کو سنوارہ نہیں

شبِ غم کے سفر پہ نکلا ہوں
آسماں پر کوئی ستارہ نہیں

عشق اِک ایسا بحر ہے شیداؔ
دوسرا کوئی بھی کنارہ نہیں

غزل

سمجھا ہوں جب سے تختِ شہی کے مزاج کو
رکھا ہے اپنے پاؤں کی ٹھوکر پہ تاج کو

کیسے کُھلیں جہاں پہ مری شخصیت کے بھید
سمجھے گا کون دھڑکنوں کے اِمتزاج کو

تخلیق کر رہا ہوں زمیں، آسماں نئے
ترتیب دے رہا ہوں میں تازہ مزاج کو

توڑے ہیں کس نے قُفل لبوں پر پڑے ہوئے
کِس نے صدا میں ڈھال دیا احتجاج کو

رکھا ہوا ہے اُس نے معطل ابھی تلک
دستِ ہنر پہ مہکے ہوئے کام کاج کو

ڈالی ہے کس نے دارورسن کی بنا یہاں
کس نے دیا رواج لہو کے خراج کو

شیداؔ تمام عمر مشقّت میں گال دی
آنکھیں ترس گئی ہیں ہماری اناج کو

غزل

جس نے ہر ایک تازہ تمنا شہید کی
اُس کی دلِ تباہ نے حسرت مزید کی

جب تک اُبھر نہ آیا مری آرزو کا چاند
میں نے لباسِ تار کو بدلا، نہ عید کی

رکھا ہمیشہ اپنی تمنا کو تشنہ لب
خونِ جگر سے میں نے محبت کشِید کی

اک عمر انتظار کی سُولی پہ میں رہا
اِک پل بھی میں نے خود سے نہ گفت و شنِید کی

میلہ لگا ہوا تھا بہاروں کا ہر طرف
میں نے گزشتہ شاخ سے مٹی خرید کی

جاگا ہے جب سے دل میں غمِ آلِ مصطفےٰؐ
بیعت ہوئی نہ مجھ سے کسی بھی یزید کی

شیداؔ ہماری آنکھ میں لوٹے گی تب نظر
ساعت پلٹ کے آئے گی جب اُنکی دِید کی

غزل

ہم نے اکثر زوال کے پل میں
خود کو ڈھالا کمال کے پل میں

سیر کرتا ہوں آسمانوں کی
اپنے اِک اِک خیال کے پل میں

ہم نے صدیوں کو مُضطرب پایا
اِک تمہارے ملال کے پل میں

صَرف نقاش کے ہوئے برسوں
تیرے حُسن و جمال کے پل میں

عرصۂ عمر رقص کرتا ہے
جانِ جاناں وصال کے پل میں

شیدؔا اُڑتی ہے خاکْ صدیوں کی
وقتِ فرقت دھمال کے پل میں

غزل

حسرتِ شوقِ بدگمان نکال
یوں بدن سے نہ میری جان نکال

چاہتی ہے زمیں سکون ذرا
بزمِ دنیا سے آسمان نکال

سر پہ پہنچی ہے فوج دشمن کی
تیر کو کھینچ اور کمان نکال

دیکھ مجھ کو یقیں کی آنکھوں سے
وسوسے دل سے مہربان نکال

اپنے سینے کو بیقرار نہ رکھ
خلشِ ذوقِ بدگمان نکال

دھوپ سے اُس طرف کوئی شیدؔا
کسی جانب سے سائبان نکال

غزل

داغ کوئی مری نظر میں نہ تھا
جب زمانے ترے اثر میں نہ تھا

رات ہوئی سَوئی تھی آنگن میں
اک دیا بھی ہمارے گھر میں نہ تھا

سوا نیزہ پر تھا اُدھر سورج
کوئی سایہ اِدھر شجر میں نہ تھا

کوئی خواہش نہ تھی زمانے کی
تیرا سودہ بھی میرے سر میں نہ تھا

منزلیں دے رہی تھیں آوازیں
قافلہ، کارواں، کوئی رہ گزر میں نہ تھا

جس پہ شیداؔ گماں سحر کا ہو
ایسا احساس بھی سحر میں نہ تھا

غزل

صورتِ حرف رائیگاں نہ ہوا
بجھ کے بھی میں دھواں دھواں نہ ہوا

لاکھ موقع ملا مجھے پھر بھی
اپنی ہستی میں آسماں نہ ہوا

شب غم ستارہ، دیپ تو کیا
کوئی جگنو بھی مہرباں نہ ہوا

اپنے کردار پر نظر رکھی
اُن کے مطلب کی داستاں نہ ہوا

آ گیا اُن کی جب نگاہوں میں
پھر مرا تذکرہ کہاں نہ ہوا

ہم سے برہم تھی زلف بھی شیدؔا
ابر بھی سر کا سائباں نہ ہوا

غزل

کون کرے اندازہ غم کا
بند ہوا دروازہ غم کا

اِک اِک داغ ابھی باقی ہے
اِک اِک زخم ہے تازہ غم کا

درد سمیٹے رکھتا ہے
اِک اِک پل شیرازہ غم کا

کون اتنا ہمدرد ہوا ہے
کون سُنے آوازہ غم کا

گُھل کر سانس نہیں آتا ہے
بُھگتا ہے خمیازہ غم کا

چاندی جیسا چہرہ شیدؔا
سونے جیسا غازہ غم کا

غزل

خوف رگوں میں بھر جاتے ہیں
شام ڈھلے جب گھر جاتے ہیں

سوچ کے مستقبل بچوں کا
ہم تو جیسے مر جاتے ہیں

مجبوری کے ہاتھوں اکثر
اُلٹے کام بھی کر جاتے ہیں

جمع روز کریں ہم خود کو
ٹُوٹ کے روز بکھر جاتے ہیں

بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے
اپنے آپ سے ڈر جاتے ہیں

شیؔدا اُن کی گلیوں میں ہم
ہاتھ پہ لے کر سر جاتے ہیں

غزل

قبل ابتدائے محبت
سوچتے انتہائے محبت

میری وفائے محبت
تیری جفائے محبت

تونے تنہا کیا
ہائے ہائے محبت

کیا نام دوں؟
تجھے رسوائے محبت

تجھے کون جانے
اب آشنائے محبت

کوچۂ سنگدل نکلی
تیری جائے محبت

اِک بات بتا
کہاں جائے محبت

بعد از جُدائی
کیوں ستائے محبت

شیؔدا شیؔدا کرتی
سُنُوں صدائے محبت

غزل

شعر کہنے سے بدگماں بھی نہیں
کوئی دنیا میں قدرداں بھی نہیں

اب زمیں بھی نہیں ہے پاؤں میں
اور سر پر وہ آسماں بھی نہیں

زندہ رہنا ہے اِس خرابے میں
کوئی ہمدرد و مہرباں بھی نہیں

دھوپ بھی ہے غضب کی چھائی ہوئی
زلفِ ہمدم کا سائباں بھی نہیں

بَل بھی رکھتا ہے اپنے ماتھے پر
وہ مگر مجھ سے بدگماں بھی نہیں

گُل ہوئے آس کے چراغ سبھی
کسی جانب مگر دھواں بھی نہیں

میں مُسلسل سفر میں ہوں شیداؔ
خواہشِ کُوئے دِلبراں بھی نہیں

غزل

اور اب یہی ہمیں اکثر گماں گزر جائے
زمانہ ٹوٹ کے ہر روز ہی بکھر جائے

سِتم کی موج میں ٹھہراؤ آ بھی سکتا ہے
عجب نہیں ہے کہ دریا کبھی اُتر جائے

بدل لو اپنے رویّے ذرا سنبھل جاؤ
کہ اِس سے پہلے قیامت کوئی گزر جائے

یہ کون صبح کا اِمکان تازہ رکھتا ہے
لہو یہ کون چراغوں میں روز بھر جائے

کسی بھی منظرِ رنگیں پہ کیا بھروسہ ہو
نگاہِ شوق اگر خاک ہی سے بھر جائے

کہو تو آپ کا اِس میں بھلا بُرا کیا ہے
جو بے کسوں کا مقدرّ ذرا سنور جائے

میں چل رہا ہوں اگر شیدؔا سیدھے رستے پر
یقیں تو آئے کسی گام پہ تو سر جائے

غزل

لمحہ لمحہ غمِ دنیا سے گزرتا ہوا دِل
ہائے یہ ٹوٹ کے سینے میں بکھرتا ہوا دل

لے کے دامن میں نیا زخم چلے آئے ہیں
اُن سے دیکھا نہ گیا میرا سنورتا ہوا دل

دھڑکنیں ہوتی تھیں رنگین اُجالوں جیسی
کبھی خورشید کی صورت تھا بکھرتا ہوا دل

گردِآلام سے ہر لحظہ اٹا رہتا ہے
اِک زمانہ ہوا دیکھا نہ نِکھرتا ہوا دل

روز اِک تازہ قیامت سے گزر جاتا ہے
روز سینے میں نظر آتا ہے مرتا ہوا دل

کیسے اُمید کے بادل پہ اُتاروں شیدؔا
رنج و آلام کی موجوں میں اُترتا ہوا دِل

غزل

دِل تُو ایسے شکستہ جان نہ ہو
بے وفاؤں سے بدگمان نہ ہو

اھلِ دِل صاحبِ نظر کے لیے
مہرباں کوئی مہربان نہ ہو

عمر گزری ہے آزمائش میں
اب کوئی اور امتحان نہ ہو

بس جو حرص و ہوس پر مبنی ہو
وہ کبھی میری داستان نہ ہو

گر بلندی ہے کُچھ زوال بھی ہے
خاک پہ رہ کے آسمان نہ ہو

زندگی ، زندگی نہیں شیدؔا
دِل کا جذبہ اگر جوان نہ ہو

(ایک شعر)

وہ میرا مجرم ہے مگر سزا نہیں دینی
چین سے جینے کی اُسے دُعا نہیں دینی

غزل

تشنہ لبوں کو ساقیا تعبیرِ خواب دے
خالی ہیں دل کے جام ذرا سی شراب دے

ورنہ یہ زندگی کا سفر کٹ نہ پائے گا
یا رب رہِ طلب میں کوئی ہمرکاب دے

دُھندلے کبھی پڑیں نہ خدوخالِ یار کے
ایسی چمک دمک اُسے ایسا شباب دے

سینے میں ہر طرف رہے یادوں کی روشنی
زخمِ جگر کو ایسے مرے آب و تاب دے

روشن رہے وفا کا ستارہ کرن کرن
راتوں کے اضطراب میں وہ آفتاب دے

اُکتا نہ جائے شیدؔا محبت سے دِل مرا
ایسے نفس نفس نہ مجھے تُو عذاب دے

غزل

رستہ طویل تر تھا تکمیل آرزو کا
اک تم نے رکھ لیا ہے بھرم میری جستجو کا

آؤ وہیں سے جوڑیں ٹوٹا تھا جس جگہ سے
یہ سلسلہ ہماری آپس کی گفتگو کا

مہکا دیا تھا جس نے سنگِ دل و نظر کا
میں منتظر ہوں اب بھی اس تیری رنگ و بُو کا

جب سے تو ہمسفر ہے راہِ طلب میں اپنا
دل کو نہیں ذرا بھی خوف وخطر عدوُ کا

آنکھوں کا مر گیا ہے پانی بھی رفتہ رفتہ
پھیکا پڑا ہوا ہے اب رنگ بھی لہو کا

ہر غم پہ مسکرائے اِس واسطے بھی شیدؔا
ہم کو رہا ہمیشہ احساس آبرو کا

غزل

ہو بھی سکتا ہے اگر ہو جائے
خیر سے زیست بسر ہو جائے

• کوئی ایسی نہیں صورت نکلی
رات ڈھل جائے سحر ہو جائے

کاٹ دینا ہے ضروری اُس کو
جب شجر بارِ ثمر ہو جائے

کچھ نہ مانگوں کسی مُنصَف سے کبھی
جو میسر تیرا در ہو جائے

کُھل بھی سکتا ہے ہمارا رستہ
رہ کی دیوار میں در ہو جائے

عین ممکن ہے کسی دن شیدآ
اُن پہ آہوں کا اثر ہو جائے

غزل

دل پہ گرچہ اثر بھی ہوتا ہے
درد بارِ دیگر بھی ہوتا ہے

حاصلِ زیست دِید ہو جن کی
اُن سے صَرفِ نظر بھی ہوتا ہے

جیت جاتا ہے عشق بعض اوقات
اور شانوں پہ سر بھی ہوتا ہے

شعر ہوتا ہے صورتِ غالبؔ
میرؔ جیسا ھنر بھی ہوتا ہے

عزم رہتا ہے زیرِ خنجر بھی
حوصلہ دار پر بھی ہوتا ہے

پنچھیوں کے لیے کبھی شیداؔ
پیڑ بارِ ثمر بھی ہوتا ہے

غزل

اب کے حالات یوں بنے ہوئے ہیں
رات ، دن کام پر لگے ہوئے ہیں

جِن کو سمجھا تھا رہنما اپنا
وہی دیوار سِی بنے ہوئے ہیں

شاخ اُمید پر گُلِ حسرت
موسَمِ غم میں بھی کِھلے ہوئے ہیں

آسمانِ سِتم تنے ہوئے تھے
آسمانِ سِتم تنے ہوئے ہیں

دل دھڑکتا ہے غیر کی جانب
غیر کی آرزو بنے ہوئے ہیں

منزلوں کے نشاں مِٹے شیدؔا
گرد آلود راستے ہوئے ہیں

غزل

وہ زمیں ہو کہ آسماں کوئی
دل کی سُنتا نہیں یہاں کوئی

کام آیا نہ مشکلوں میں کبھی
کوئی ہمدرد، مہرباں کوئی

زندگی کا یقین جاتا رہا
جب سے ٹھہرا ہے بدگماں کوئی

سارے ارمان بجھ گئے دل کے
ایسے اُٹھنے لگا دھواں کوئی

کھینچ رکھی ہے میرے دامن پر
اشکِ مُضطر نے کہکشاں کوئی

بانٹ کے جو غمِ جہاں شیدؔا
ایسا مخلص بھی اَب کہاں کوئی

غزل

قدم اُلٹے سبھی پڑنے لگے ہیں
یہ ہم کس راہ پہ چلنے لگے ہیں

ہواؤں کو خبر کیسے ہوئی ہے
دیئے دیوار پر جلنے لگے ہیں

بہت آسان جینا ہو چلا تھا
ارادے خاک میں ملنے لگے ہیں

اس عہدِ کم نظر میں بے غرض بھی
تقاضے ہر گھڑی کرنے لگے ہیں

کہاں ہم زندگی کو لے کے جائیں
دھماکے ہر طرف ہونے لگے ہیں

یہ کیسی اُگ رہی ہیں دوست فصلیں
یہ کیسے بیج ہم بونے لگے ہیں

کسی کے پاؤں کی آہٹ سے شیداؔ
فضاء میں ساز کیا بجنے لگے ہیں

غزل

میں جس دن سے ٹھکانے لگ گیا ہوں
ہر اِک غم کو بُھلانے لگ گیا ہوں

مری جب سے زباں پر دسترس ہے
بہت باتیں بنانے لگ گیا ہوں

دھمالیں پڑ رہی ہیں دھڑکنوں میں
دلوں کے گیت گانے لگ گیا ہوں

ستارہ وار تیری آرزو میں
وفا میں جگمگانے لگ گیا ہوں

جہاں صحرائے غم پھیلا ہوا
وہیں خیمے لگانے لگ گیا ہوں

کُھلی جب سے حقیقت اس جہاں کی
میں شیدؔا مسکرانے لگ گیا ہوں

غزل

اِبتدا اپنی انتہا اپنی
مِل گئی خاک میں انا اپنی

اے مری آرزو کے ماہِ طلب
کبھی صورت ذرا دِکھا اپنی

ہم نے تجویز کر کے رکھی ہے
خود ہی اپنے لیے سزا اپنی

لاکھ پھینکی ہے جانبِ کوہسار
رہ رووَں نے مگر صدا اپنی

ہم نے پھکپے ہیں عشق کے کاندھے
لوگ بخشیں گے کیا خطا اپنی

وہ بھی برسی ہے دشت پر شیدؔا
ہم نے سمجھا جِسے گھٹا اپنی

غزل

لمحہ لمحہ جیون سے بے زار رہا
بے ترتیب فسانے کا کردار رہا

روشن کرکے ایک دیئے کو پلکوں پر
ظلمتِ شب کے اندھیارے پہ بار رہا

جاگ اُٹھی جب سینے میں احساس کی لَو
نیند کے عالم میں بھی مَیں بیدار رہا

دھوپ نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں آنگن میں
دیواروں پہ سایۂ اشجار رہا

جب سے خون جلانے کا فن آیا ہے
سورج سے بھی روشن تر کردار رہا

یہ جو چمک ہے شیداؔ میرے شعروں میں
ایک ستارہ، ایک دیاء معیار رہا

غزل

بھڑاس ایسے دلوں کی نکالتے ہیں ہم
شب سِتم میں دیوٗں کو اُچھالتے ہیں ہم

جب اور کوئی بھی صورت نہیں نکل سکتی
جہاں کے کرب کو شعروں میں ڈھالتے ہیں ہم

کبھی کبھی تو زمیں پاؤں میں نہیں ہوتی
کبھی کبھی تو فلک کو سنبھالتے ہیں ہم

نہ پوچھ رزق کمانے کی وحشتیں ہم سے
نہ پوچھ پیٹ یہاں کیسے پالتے ہیں ہم

ہزار آبلے آنکھوں میں دوڑ جاتے ہیں
نگاہ جب بھی زمانے پہ ڈالتے ہیں ہم

ہمیشہ موتی نکلتے ہیں خاک سے شیدؔا
جہاں بھی پاؤں کی مٹی کھنگالتے ہیں ہم

غزل

طلب کہ آمادۂ سفر تھی
اگرچہ دُشوار رہ گزر تھی

جِدھر تھا شکر مرے عدو کا
سپاہ میری بھی سب اُدھر تھی

اُسی کی آنکھیں نکال دی ہیں
کہ جس کی حالات پر نظر تھی

مجھے میسّر تھا ایک سایہ
ہوائے تازہ بھی میرے گھر تھی

صدی کو پل میں گزار آیا
حَدِّ زمانہ یوں مختصر تھی

رکھا نہ اُس پہ قدم بھی شیدؔا
وہی جو دنیا کی رہ گزر تھی

غزل

دل کی باتیں اُنہیں سُنائیں کیا
آبرُو عشق کی گنوائیں کیا

پھر سے کھائیں کوئی نئی ٹھوکر
پھر سے تازہ فریب کھائیں کیا

چھین لیتا ہے دل کا چین قرار
بے وفا سے نظر ملائیں کیا

جب کوئی مقصدِ حیات نہیں
کشتیاں لوگ پھِر جَلائیں کیا

بے وفا ، بے وفا ہی ہوتا ہے
بے وفاؤں کو آزمائیں کیا

ہر طرف حِسیں ہے، دھواں شیدؔا
کسی جانب نظر اُٹھائیں کیا

غزل

زخم تازہ، دردِ دل، تنہائیاں
عشق دیتا ہے سدا رُسوائیاں

ہوتے ہوتے آنکھ پتھر ہو گئی
ناچ اُٹھیں ہر نظر پرچھائیاں

کون اُترے ٹھہرے پانی میں کبھی
کون دیکھے درد کی گہرائیاں

ڈھلتے ڈھلتے بربطِ غم میں ڈھلیں
اپنے حصے کی سبھی شہنائیاں

جب میں آتا ہوں گلی کے موڑ پر
طعنے دیتی ہیں مجھے تنہائیاں

کچھ نہ پوچھو اُس کے پیکر کے خطوط
رقص میں ہیں نور کی رعنائیاں

بُجھ گئے ہیں شیداؔ کیا ارمانِ دل
کیسی کیسی حسرتیں گہنائیاں

غزل

چھوڑ کر دنیا کا مسکن لوٹ کر جانا پڑا
آخر اِک دن اپنی جانب ہی پلٹ آنا پڑا

آگ پر چلنا پڑا اِس امتحانِ عِشق میں
پاؤں میں چھالے پہن کے رقص فرمانا پڑا

بُجھ رہی تھی رفتہ رفتہ آنکھ میں میری نظر
اشک ، خُونِ رنگ سے یہ غار چمکانا پڑا

ہو گئے مجبور ہم اس دل کے ہاتھوں اس طرح
جان کر بھی اِک نیا دھوکہ سدا کھانا پڑا

جو اُڑاتے تھے ہمیشہ میری باتوں کا مذاق
ایک دن آخر اُنہیں لوگوں کو پچھانا پڑا

لگ گئی شیدؔا مجھے بھی اِس زمانے کی ہوا
جو دیا دنیا نے مجھ کو اُس کو ، لوٹانا پڑا

غزل

شک کی نظر سے دیکھا زمانے نے ، شک کیا
ہم نے تو کارِ عشق مگر بے دھڑک کیا

اُن سے ہوئی تھی پہلی ملاقات جس جگہ
ٹکڑا وہی زمیں کا مثالِ فلک کیا

ٹھہرا نہ اِک مقام پر یہ قافلہ کہیں
زخموں نے دل سے رنجِ سفر جان تک کیا

مُرجھائے جس جگہ بھی تری آرزو کے پھول
خونِ جگر سے شاملِ کارِ مہلک کیا

شاخِ طلب پہ کھلنے لگے تازہ برگ و بار
یادوں کو جب پرندوں کی صورت چہک کیا

اِک کشمکش کہیں تھی جو رنجِ جُدائی کی
شامل کیا لہو میں لہو کی کسک کیا

شیدؔا تمام زخمِ جگر جمع کر کے آج
اپنے لیے محاذِ جنوں پر کمک کیا

غزل

میں در بدر رہا ہاتھوں پہ اپنی جان لیے
عجیب مجھ سے محبت نے امتحان لیے

رواں دواں ہوں رہ زیست کی مُسافت پر
میں اپنے جسم پہ صدیوں کی اِک تھکان لیے

ڈھلی نہ دھوپ غم حادثات کی جس دم
نحیف جسم کے سائے سَروں پہ تان لیے

نکل سکی کوئی صورت نہ جان بخشی کی
اگرچہ شاہ کے فرمان سارے مان لیے

تمام عمر مُیسّر نہ آسکی کوئی چھت
اُڑائی خاک سدا خواہشِ مکان لیے

لبوں پہ مُدعا دل کا نہ آسکا شیداؔ
زباں کُھلی نہ ہماری کبھی زبان لیے

غزل

جب دھڑکن مجذوب ہوئی
دنیا کی محبوب ہوئی

پھر میری اُمید کوئی
ہوتے ہوتے خوب ہوئی

دنیا داروں کو اکثر
دنیا ہی مطلب ہوئی

اب تو بات محبت کی
کہہ دینا معیُوب ہوئی

ایک ہماری قسمت ہی
ہر لمحہ معتوُب ہوئی

ہر ارمان مرا شیدا
ہر دھڑکن مصلُوب ہوئی

غزل

شوقِ نظارہ سنّورنے کا نہیں
ہجر کا موسم گزرنے کا نہیں

کوئی بھی اب اِس جہانِ سنگ میں
کام اھلِ دل کے کرنے کا نہیں

چشمِ غم کا ہے بہاؤ اِس طرف
یہ سمندر تو اُترنے کا نہیں

روگ کہتے ہیں محبت کا جسے
یہ کسی بھی غم سے ڈرنے کا نہیں

دیکھ آیا ہوں میں سارا گلستان
پھول کوئی بھی نکھرنے کا نہیں

شیدؔا ہم اھلِ نظر کے واسطے
کام کوئی کر گزرنے کا نہیں

غزل

اندیشہ ہائے تنگیٔ داماں بھی چھوڑ دے
پھر اِس کے بعد محفلِ یاراں بھی چھوڑ دے

یہ دور پتھروں کا ہے پتھر کے لوگ ہیں
اُمید چھوڑ پیار کا ارمان بھی چھوڑ دے

اب کوئی بھی کسی کی خبر پوچھتا نہیں
دامن جھٹک دے وصل کا امکان بھی چھوڑ دے

گرد و غبارِ راہ میں کیسے کِھلے وہ پھول
گلدان توڑ دے جو گلستاں بھی چھوڑ دے

دل میں اگر نہیں ہے مہکنے کی آرزو
اے باغبان جشنِ بہاراں بھی چھوڑ دے

شیدؔا اگر دیئے پہ بھروسہ نہیں تجھے
دامانِ آفتابِ فروزاں بھی چھوڑ دے

غزل

کھو نہ جائے ذات کا محور کہیں
ہو نہ جائے زندگی پتھر کہیں

ڈگمگاتی ہے جو ہونٹوں پر صدا
شور ہے برپا مرے اندر کہیں

آؤ دیکھیں غور سے دیوار کو
ہو گا اِس دیوار میں بھی در کہیں

منتظر ہے بادلوں کا عمر سے
دھول میں لپٹا ہوا منظر کہیں

مجھ کو میری ذات میں مت ڈھونڈنا
رہ رہا ہوں آج کل باہر کہیں

کرچی کرچی میرے چُھونے سے مگر
ہو نہ جائے کانچ کا پیکر کہیں

دھڑکنوں میں حشر ہے شیدؔا بپا
درد سا رہنے لگا اکثر کہیں

غزل

ہے تعلق اس قدر تحریر سے
بات کرتا ہوں تیری تصویر سے

بھر لیا میں نے چراغِ زندگی
ڈھلتے سورج کی گھنی تنویر سے

کب کُھلا قیدِ قفس کا در کوئی
پاؤں نکلے کب مرے زنجیر سے

سر نہیں دستار پر رکھی نظر
جی رہا ہوں اس لیے توقیر سے

اک ذرا جو کی محبت کی خطاء
حشر برپا ہو گیا تقصیر سے

جب سے شیدؔا نیند ٹوٹی ہے مری
ڈر رہا ہوں خواب کی تعبیر سے

غزل

لوگ اتنے بھی پیارے لگتے ہیں
زندگی کے سہارے لگتے ہیں

سیلِ غم پھر اُمڈنے لگتا ہے
جب بھی ارمان کنارے لگتے ہیں

تیری صورت نہ جب نظر آئے
پھیکے پھیکے نظارے لگتے ہیں

مُدتوں بات تک نہیں ہوتی
اُن سے بھی جو ہمارے لگتے ہیں

یہ جو چلتے ہیں تان کر سینہ
یہ محبت میں ہارے لگتے ہیں

اپنے ماضی کے کچھ گماں شیداؔ
خاک میری اُڑانے لگتے ہیں

غزل

جب سے آئی وصالِ یار کی رات
میری مُٹھی میں آئی ہر سوغات

ساز بجنے لگے فضاؤں میں
دل نے گائے وہ مدبھرے نغمات

سرد اُمید پھر سے جاگ اُٹھی
پھر جوانی پہ آگئے جذبات

قطرہ قطرہ ہے موتیوں جیسا
بادلوں سے ہوئی ہے یوں برسات

تیرے ہونے سے معتبر ہوں میں
ورنہ کچھ بھی نہیں ہے میری ذات

ہو بھی سکتے ہیں ایک ہم شیدآ
ہو بھی سکتی ہے دشمنوں کو مات

غزل

آؤ کچھ تو پیار کی باتیں کریں
دشت میں گلزار کی باتیں کریں

جھڑ بھی سکتا ہے اُداسی کا غبار
حُسن کے شہکار کی باتیں کریں

ڈھل بھی سکتی ہے غمِ دنیا کی دھوپ
سایۂ اشجار کی باتیں کریں

کون سُنتا ہے مریضِ عشق کی
کیا دلِ بیمار کی باتیں کریں

خار سے جھاڑیں اُداسی کا غبار
پھول سے مہکار کی باتیں کریں

جس سے شیدؔا جھوم اُٹھے زندگی
اِک اُسی کردار کی باتیں کریں

غزل

نہ مانگی روشنی پھر بھی جہاں سے
دھواں اُٹھتا رہا دل کے مکاں

وگرنہ زندگی بے کیف ہوتی
اگر رہتا تعلق آسماں سے

غبار آلود سارے راستے ہیں
شکایت کیا ہو میرِ کارواں سے

تمہارے واسطے اب بھی ستم گر
دُعا اُٹھتی ہے دل کے آستاں سے

تعلق پھر ہی شیدؔا جُڑ سکے گا
ہٹے گا جب زمانہ درمیاں سے

غزل

ہر نفس گرچہ اختلاف کیا
زندگی سے نہ انحراف کیا

اُن کے رستے کا ایک اِک کانٹا
اپنی پلکوں سے ہم نے صاف کیا

اکثر اوقات باوضو ہوکر
کوچۂ یار کا طواف کیا

ہم نے اپنائی طرزِ درویشی
کام دل کے سدا خلاف کیا

دوستوں سے بھی درگزر رکھی
دشمنِ جاں کو بھی معاف کیا

اک پری وش کی سوچ نے شیدؔا
دل کی گلیوں کو کوہِ کاف کیا

غزل

یہ سماعت جدھر لگا دی ہے
اُس نے بھی سرسری صدا دی ہے

بجھ گیا جب سویا تمنا کا
ایک مشعل نئی جلا دی ہے

کس نے ڈالی ہے اِک نظر مجھ پر
کس نے قسمت مری جگا دی ہے

کون اُترا ہے اِس خرابے میں
کس نے اِس حبس میں ہوا دی ہے

تیرا ارمان بھی مٹا ڈالا
آرزو بھی تیری بجھا دی ہے

ایک بے درد کے لیے شیدآ
زندگی داؤ پر لگا دی ہے

غزل

مِٹی کی مِثل آس کا مہتاب کر دیا
ایسے دلِ خراب نے بے تاب کر دیا

اندر کی سمت گرتے ہوئے اشکِ درد نے
میری رگِ لہو کو بھی زہراب کر دیا

جینے کا آگیا ہے سلیقہ بہر قدم
اِس عاشقی نے صاحبِ آداب کر دیا

ابرِ بہار ٹوٹ کے برسا کچھ اس طرح
بنجر زمینِ دل کو بھی سیراب کر دیا

آنے لگیں ہیں جسم پہ بستر کی سلوٹیں
نیندوں نے چشمِ خواب کو بے خواب کر دیا

شیدؔا ایک ایسا کیمیاگر بھی ملا مجھے
چھُوکر مجھے بھی صورتِ مہتاب کر دیا

غزل

شہرِ گمنامی میں جب شہرت کا دروازہ لگا
عشق میں بدنام ہونا بھی بہت اچھا لگا

پہلے اُن کی جستجو میں دل دھڑکتا تھا بہت
اور اب اُن کے بچھڑ جانے کا ہے دھڑکا لگا

شدتِ تنہائی سے گھبرا گیا تھا اتنا دل
اِک نظر بھی جس نے دیکھا وہ ہمیں اپنا لگا

کوچۂ دلدار سے لوٹا ہوں جب بھی میں کبھی
اپنے گھر کا راستہ بھی دشت کا رستہ لگا

لوٹ آیا ہوں میں تشنہ اِس لیے بھی دوستو
ہو بہو اپنی طرح دریا مجھے پیاسا لگا

غور سے جب اُس کو دیکھا، جائزہ اُس کا لیا
وہ طبیعت میں سراپا صورتِ دنیا لگا

جھڑ بھی سکتا ہے غبارِ آرزو شیدؔا کبھی
آئینے کے عکسِ مدھم پر مرا چہرہ لگا

غزل

ٹھوکر لگی ہمیشہ، اکثر فریب کھائے
کس کی مجال اِتنی ، دنیا سے بچ کے جائے

دنیا ہے ایک زنداں ہے قید جس میں انسان
اک دشتِ بے کراں دُنیا کی یہ سرائے

اک سعیِ رائیگاں ہے آسودگی کی خواہش
ڈھلتے نہیں کہیں بھی رنج والم کے سائے

ہر سمت اِک دھواں ہے ہر سمت اک گھٹن ہے
کیسے لبوں پہ آئے کوئی سانس مسکرائے

لیتا ہے ضبطِ دل کا یہ امتحان ہر پل
ہر لحظہ آدمی کو یہ عشق آزمائے

ہر آدمی ہے پتھر شیدؔا اِس عہد نو کا
کوئی کسی کو دل کا کیا مُدعا سنائے

غزل

گُماں نے ایسے شکست دی ہے
یقیںِ کی صورت بگڑ گئی ہے

فریب کھائے ہیں زندگی بھر
ہماری دشمن یہ سادگی ہے

لڑائی لڑتے ہیں اپنی اپنی
سبھی کو اپنی پڑی ہوئی ہے

صفِ عدد میں کھڑے ہوئے ہو
یہ دوستی ہے کہ دشمنیِ ہے

ہماری باتیں ہیں چار جانب
ہماری شہرت گلی گلی ہے

کہ دل بھی پسر ہوئے ہیں شیدآ
نظر بھی پتھر کی ہو گئی ہے

غزل

کچھ اِس لیے بھی دل و نظر میں عجب دہائی پڑی ہوئی ہے
وصال رکھا تھا جس جگہ پر، وہاں جدائی پڑی ہوئی ہے

قدم اُٹھایا ہے جب سے میں نے، چُنا ہے جب سے وفا کا رستہ
جدھر بھی دیکھوں نظر اُٹھاکر، اُدھر دہائی پڑی ہوئی ہے

بہت ہی خود پہ تھا زعم ہم کو، کہ شعر کہنے کا شوق ہم کو
اِدھر قلم ہے، اُدھر ہماری سخن سرائی پڑی ہوئی ہے

کبھی نہ سوچا کبھی نہ سمجھا کہ ہاتھ دھوکر ہمارے پیچھے
جناب کیسے، حضور کیونکر، یہ جگ ہنسائی پڑی ہوئی ہے

اگر میسّر ہو کوئی لمحہ سکونِ دل کا تو دوست کیسے
مرے گلے میں تمہاری ہر پل ہی بے وفائی پڑی ہوئی ہے

شکست کھائی ہے پھر بھی شیدؔا محبتوں کے مقابلے میں
ہر ایک حسرت کہ اکثریت میں دو تہائی پڑی ہوئی ہے

غزل

دنیا سے پھر بھی مجھ کو محبت نہیں رہی
تشنہ اگرچہ کوئی بھی حسرت نہیں رہی

سب کچھ بدل گیا ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
پہلا مزاج، پہلی طبیعت نہیں رہی

کھوٹے کھرے نے دھار لیا ایک جیسا روپ
اب تو کسی بھی شے میں حقیقت نہیں رہی

دُھندلا گئے ہیں عکس، شکستہ ہے آئینہ
پہلے سے خدوخال، وہ صورت نہیں رہی

کھوئے ہوئے ہیں حرص و ہوس میں کچھ اس طرح
اِک دوسرے کی ہم کو ضرورت نہیں رہی

شیداؔ ہر ایک سمت دُکھوں کا نزول ہے
دنیا میں چار سو کہیں راحت نہیں رہی

غزل

جیسے اب ہیں یوں خدوخال نہ تھے
دل کے ارمان پائمال نہ تھے

جیسے بھٹکے ہیں تجھ کو کھونے پر
در بدر اس طرح خیال نہ تھے

جا رہے تھے وہ چھوڑ کر مجھ کو
سانس میرے ذرا بحال نہ تھے

ہستیٔ دہر کا حوالہ تھے
ہم غمِ ذات کی مثال نہ تھے

ٹوٹے لمحے تھے چند دامن میں
ہم کبھی خود میں ماہ و سال نہ تھے

جیسے اب درد سے ہوئے شیدآ
ہم کبھی ایسے مالا مال نہ تھے

غزل

پتھر ہوئی تمنا اُلٹا ہوا ستارا
موجوں نے بھر دیا ہے اُمید کا کنارا

ہم نے ہر اک قدم پہ تازہ فریب کھایا
ہم نے تمام جیون کچھ اس طرح گزارہ

بیگانہ ہاتھ کوئی ، جو میرا ہاتھ تھامے
ہر شخص کو صدا دی ہر شخص کو پکارا

ارمان ہوتے ہوتے سب راکھ ہو گئے ہیں
بھڑکا نہ کوئی شعلہ بھڑکا نہ اِک شرارہ

بدلا جو وقت تھوڑا محسوس ہو رہا ہے
ہم ہیں یہاں اکیلے کوئی نہیں ہمارا

حالات جب بُرے ہوں گردش میں ہو مقدر
ایسے میں کوئی شیدا بنتا نہیں سہارا

غزل

ایسے غمِ حالات کی تحریر بنائی
زخموں سی ہر اک لفظ نے تصویر بنائی

ہر آس کُھرچ ڈالی دلِ زار سے تیری
اُس خوابِ گزشتہ کی یُوں تعبیر بنائی

اک شہر بسایا ہے تمناؤں کا پھر سے
اُمید تری پاؤں کی زنجیر بنائی

چمکا نہ کبھی بام تمنا پہ ستارہ
ہاتھوں کی لکیروں نے یُوں تقدیر بنائی

ظلمت میں کوئی خونِ جگر آنکھ میں بھر کر
بینائی ملاکر کوئی تنویر بنائی

سر کو نہیں دستار کو مٹی سے اُٹھاکر
یُوں شیدؔا زمانے میں ہے توقیر بنائی

غزل

چھا گیا ہر سُو بڑھاپا سا جوانی کیا ہوئی
کیا ہوئے کردار اپنے وہ کہانی کیا ہوئی

جستجوئے رِزق میں شوقِ جنوں پہ کیا بنی
عشق کی گلیوں میں اپنی حکمرانی کیا ہوئی

حشر سا برپا ہوا ہے گھر کی سب ترتیب میں
گُم مرے کمرے سے تیری اک نشانی کیا ہوئی

کیا ہُوئیں احساس کے ساحل کی وہ رنگینیاں
کیا ہُوئی منہ زور جذبوں کی روانی کیا ہوئی

کوئی بھی آنسو نہ اپنا موتیوں میں ڈھل سکا
آنکھ میں خونِ جگر کی بُوند پانی کیا ہوئی

زندگی بھر کی مری جاں ایک تہمت کے سوا
زندگی بھر کی ہماری رائیگانی کیا ہوئی

برق و باراں کا لگا ہے شیدؔا یہ دھڑکا سا کیا
وہ فلک سے دوستی اپنی پرانی کیا ہوئی

غزل

اِک کائی رنج و غم کی رہتی ہے بام و در پر
آسیب کا ہے موسم اب بھی ہمارے گھر پر

احساسِ بے اماں نے پائی نہیں اماں بھی
جالے بنے ہوئے ہیں احساس کی نظر پر

راہ ستم میں ٹھہرے ہر لمحہ جستجو میں
مائل رکھا ہے تیری اُمید نے سفر پر

پلکوں پہ نقش پائے اشکِ غمِ زمانہ
پھر بھی کھلے نہ آنسو اُس چشمِ چارہ گر پر

بدلا لباسِ دُنیا بدلا لباسِ ہستی
پھر بھی نہ چھوڑ پائے کچھ نقش اُس نظر پر

محفوظ ہو گیا ہے دشمن سے اپنا آنگن
دھوکہ ہوا ہے شیداؔ اکثر یہ بام و در پر

غزل

سفرِ دشت ہنر سے ہو آیا
کافی غفلت نگر میں سو آیا

رہنے دے خوش حیات میں اب تو
قفسِ زیست میں ہوں رو آیا

تازہ ظلمت کے سب نشاں تھے ہنوز
آبِ دیدہ سے میں ہوں دھو آیا

چار سر پر اُٹھانے والے تھے
بوجھ کاندھوں پہ اپنا ڈھو آیا

شیدؔا مجھ سے فرات نادم تھا
پانی پانی کیا، ڈبو آیا

غزل

تیرہ بختوں کو خبر کیا ہے، اُجالا کیا ہے
سرد مہری سی ہے کیا اور جوالہ کیا ہے

کسی مجذوب سے کیا پوچھ رہے ہو یارو
کوئی مسجد ہو کہ مندر ہو شوالا کیا ہے

کسی مُفلس کا یہ عنوان ہی نہیں ہے ہرگز
نقد کیا چیز ہے اور دوست حوالہ کیا ہے

پوچھ یہ بات مرے دوست چکوروں سے کبھی
چاند کیا چیز ہے اور چاند کا ہالہ کیا ہے؟

شیؔدا یہ راز سمجھ سکتے ہیں اصحاب کہف
غار کیا چیز ہے اور غار کا جالا کیا ہے؟

غزل

یہ خرابی مرے سبب میں ہے
زندگی غیر کی طلب میں ہے

دوست! خورشید اپنی قسمت کا
مُدتوں سے حصارِ شب میں ہے

میں ہوں فرہاد کے قبیلے سے
یہ بھی خوبی مرے نسب میں ہے

جانے کیا ہو گیا ہے دنیا کو
آدمی، آدمی غضب میں ہے

روشنی جس کی ہے زمانے میں
وہی خورشید جو عرب میں ہے

مطلعٔ فن ہے شیدؔا گرد آلود
دُھول کچھ اِس قدر ادب میں ہے

غزل

اُس کی ذات کو جان لیا
خود کو جب پہچان لیا

جیسا اُس نے حُکم دیا
ویسا میں نے مان لیا

دھوپ اُتری تو اپنا رسا یہ
اپنے جسم پہ تان لیا

ایک تمنا کی خاطر
اندر باہر چھان لیا

اُس نے جینے مرنے کا
مجھ سے بھی پیمان لیا

دیپ جلا تو آندھی نے
اِک لمحے میں آن لیا

شیدؔا خود کو آخر کار
اپنا مرشد مان لیا

غزل

جب سے ڈالی نئے لہو کی طرح
سانس چلتے ہیں آبجو کی طرح

آج کل دھڑکنوں میں کرتا ہوں
اُن کو محسوس آرزو کی طرح

کس طرف جاؤں زندگی لے کر
دوست ملنے لگے عدد کی طرح

میں نے رکھا سدا بھرم اِس کا
عشق اپنایا آبرو کی طرح

رگِ احساس ایسے مہکاؤ
ہُوبہُو دوست، رنگ و بُو کی طرح

کس نے اِذنِ سفر دیا مجھ کو
کس نے ڈالی ہے جستجو کی طرح

زندگی یوں گزار دی شیدؔا
صحنِ گلشن میں ہاؤ ہُو کی طرح

غزل

لے کے دامن میں زحتِ حیات
آدمی بھر رہے ہیں جستِ حیات

کسی صورت میں بارَوَر نہ ہُوا
کسی موسم میں بھی درزحتِ حیات

ہر نفس اِک عذاب جھیلا ہے
ہے یہی اپنی سرگذشتِ حیات

عمر گزری اِسی تمنّا میں
جاگ پایا نہ اپنا بختِ حیات

ایک جیسی سدا نہیں رہتی
جتنی مضبوط ہو گرفتِ حیات

ایک اُسکے سوا نہیں شیدؔا
دوسرا کوئی سرپرستِ حیات

غزل

آؤ ذرا اب کُھل کے یارو رو لیتے ہیں
بھول کے سب کچھ اپنا اپنا ہو لیتے ہیں

ذہن کلامی چین سے سونے دے نہ کبھی
ہو کے علیحدہ خود سے کچھ دم سو لیتے ہیں

بھیڑ میں وہ جو شخص اکیلا ہو جاتا ہے
لوگ ہمیشہ ایسے شخص کی ٹو لیتے ہیں

حق کی چادر اوڑھ کے رکھنا خود پر تُم
نشتر آنکھ میں آج کے شیخ چبھو لیتے ہیں

شعر کی صورت ہیں شیدآ ہم اہلِ سخن
لوٹاتے ہیں دُنیا سے ہم جو لیتے ہیں

غزل

پاؤں سے اُن کی گلی کا راستا باندھے ہوئے
چھالا چھالا چل رہا ہوں حوصلہ باندھے ہوئے

تان رکھی ہے خیالوں پر گزشتہ کی سحر
رات کی زلفوں سے یادوں کا دیا باندھے ہوئے

ٹکڑا ٹکڑا چنتا پھرتا ہوں میں اپنے رزق کو
چاک دامن میں پرندوں کی صدا باندھے ہوئے

جَل اُٹھا ہے پھر کسی امکان کا تازہ چراغ
آگیا دامن سے کوئی پھر ہوا باندھے ہوئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں کوئی صدائے بازگشت
کوہ ساروں کی سماعت سے صدا باندھے ہوئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں شیداؔ اپنے چہرے کے نقوش
آنکھ کی پُتلی سے عکسِ آئینہ باندھے ہوئے

غزل

صرف اِک انتظار باقی ہے
کب کوئی اختیار باقی ہے

میرا پروردگار باقی ہے
میرا پروردگار باقی ہے

پھول تھے اپنے خون میں نہلائے
میں نے سمجھا بہار باقی ہے

دھڑکنیں ہیں ابھی جواں اپنی
آرزو کا خمار باقی ہے

تھوڑی خیرات ڈالتے جانا
دامنِ تار تار باقی ہے

لاکھ شیدؔا لہو جلایا مگر
ظلمتوں کا حصار باقی ہے

غزل

چاند اُترا ہے جب سے پانی میں
آگیا دل مِرا روانی میں

ہم نے پیری کی سمت موڑ دیئے
دل کے ارمان نوجوانی میں

غم سے فرصت نہ پائی اِک لمحہ
عمر گزری ہے رائیگانی میں

روز ساحل نیا اُتارا ہے
ہم نے دریا کی بے کرانی میں

اُس نے جاتے ہوئے جو بخشی تھی
آنکھ گُم ہے اُس نشانی میں

سچ پہ کیسے ثمر لگے شیداؔ
لوگ گُم ہیں غلط بیانی میں

غزل

جو ہے دل میں لبوں پر اُسے لا سکوں
اِتنی قسمت کہاں کہ اُنہیں پا سکوں

ہر نفس ساز بجتے ہیں امکان کے
پھر بھی نغمہ وفا کا نہ میں گا سکُوں

ایک دیوار ہے راستے میں کھنچی
اِس طرف سے نہ میں اُس طرف جا سکوں

مُدّتوں سے اِسی ایک کوشش میں ہوں
کسی صورت میں اُن کے قریب آسکوں

اِس قدر بھی جہاں کو گوارہ نہیں
چھوڑ کر میں جہاں، اُن کو اپنا سکُوں

آڑھے آئی ہے شیداؔ انا ہر گھڑی
زخم دل کا کسی کو نہ دِکھلا سکوں

غزل

اپنے محور سے ہٹ رہی ہے حیات
لحظہ لحظہ سمٹ رہی ہے حیات

موت بستی ہے جِن جہانوں میں
اُسی جانب پلٹ رہی ہے حیات

ہم رہی جب ملی ہے سانسوں کی
میرے رستے سے ہٹ رہی ہے حیات

کتنی صدیوں سے اِس زمانے میں
مِثل خیرات بٹ رہی ہے حیات

دُھند چھانے لگی ہے پیکر پر
جسم و جاں کو اُلٹ رہی ہے حیات

وقت کے ساتھ ساتھ ہر لمحہ
اپنی قامت میں گھٹ رہی ہے حیات

ہو کے مایوس اِس زمانے سے
مجھ سے شیدؔا لپٹ رہی ہے حیات

غزل

آدمی جِن کو کم سمجھتے ہیں
ایسی باتوں کو ہم سمجھتے ہیں

میں سمجھتا تھا اِس جہاں والے
میرے اندر کا غم سمجھتے ہیں

راہِ ہستی ہے کس قدر دُشوار
راہ رو کے قدم سمجھتے ہیں

اُس کی، اور میری دھڑکنوں کو یہ لوگ
میری صورت بہم سمجھتے ہیں

تیر، تلوار کی طرح حاکم
اھلِ فن کا قلم سمجھتے ہیں

تشنگی میں بھی بھیک کا پانی
ہم اناء والے سَم سمجھتے ہیں

ہم سمجھتے ہیں پیار کو شیدؔا
سب کی طرزِ ستم سمجھتے ہیں

غزل

کی ہے جب بھی کبھی چمن کی بات
اُن کو بھائی نہیں سخن کی بات

ہاتھ سب کے رہیں گریباں میں
کون سُنتا ہے پیرھن کی بات

ایک میلہ سا لگ گیا مجھ میں
جب ہوئی تیری انجمن کی بات

چاک دامن گریباں ہے صد تار
ہے یہی اپنے پیرہن کی بات

یاد آنے لگی خطا اپنی
جب بھی چھیڑی کبھی گگن کی بات

عشق پر دُھول پڑ گئی شیداؔ
خاک و خون ہو گئی لگن کی بات

غزل

ستارہ جب مرا ہمدم ہوا ہے
اُجالا پھر مرا محرم ہوا ہے

شبِ بے نور جب سے چھا گئی ہے
سحر کا غم ہمارا غم ہوا ہے

دکھائی دے رہا ہے چاند آدھا
جہاں میں معجزہ یہ کم ہوا ہے

بھری ہے جست ارمانوں نے ایسے
کسی آہو کا جیسے رم ہوا ہے

غمِ دُنیا کا جس میں تذکرہ ہو
کہاں تحریر وہ کالم ہوا ہے!؟

وہی شیداؔ رگِ احساس میں ہے
اُسی کا تذکرہ دم دم ہوا ہے

غزل

ٹہنی ٹہنی غنچہ کھلنا ہوتا ہے
موسمِ غم کا اِک دن ڈھلنا ہوتا ہے

بھیڑ میں اپنی اُنگلی تھام کے آخرکار
اِک دن تو انسان کو چلنا ہوتا ہے

آجائے جب جان کو، ظلم زمانے کا
دنیا کو انداز بدلنا ہوتا ہے

آجاتا ہے ایک زمانہ رستے میں
اُن کی گلی میں جب بھی جانا ہوتا ہے

سر ٹکرانا پڑ جاتا ہے پتھر سے
قیدِ قفس میں جان سے جانا ہوتا ہے

جب بھی شیداؔ تنہا میں ہو جاتا ہوں
اُس کے ہمراہ ایک زمانہ ہوتا ہے

غزل

آجکل دل یُوں تیری یاد میں ہے
یہ جہاں جس طرح تضاد میں ہے

تجھ کو ڈھالا ہے اپنے شعروں میں
نوکِ خامہ عجیب داد میں ہے

اِس لیے میں الگ ہوں لوگوں سے
اِک خرابی سی اجتہاد میں ہے

جب سے لوٹے ہیں پنچھیوں کے پر
ہر گھڑی جیسے ابروباد میں ہے

گم ہوا اعتبار ہستی بھی
آدمی کس قدر تضاد میں ہے

ایک مُدّت ہوئی، زمانہ ہوا
حکمران سیِ انسداد میں ہے

ایک دریا رواں دواں شیدؔا
ساحلِ دامنِ مراد میں ہے

غزل

گردشِ خوں بھی ہے بدن میں اُداس
آدمی یُوں ہوئے وطن میں اُدس

ایسے چلتے ہیں سانس سینے میں
جیسے لکڑی کوئی اگن میں اُداس

بادِ صرصر کو کامیابی مِلی
چل رہی ہے ہوا چمن میں اُداس

ہے یہی اِک سبب اُداسی کا
میں ہوں بس آپ کی لگن میں اُداس

اِذنِ گویائی کے لیے کب سے
ایک اِک لفظ ہے دہن میں اُداس

یُوں ہُوں اپنی قبا میں رنجیدہ
جیسے مجذوب پیرھن میں اُداس

تار شیداؔ گریباں اپنا ہے
عشق پھرتا ہے دشت و بن میں اُداس

غزل

روگ ٹھہرا سخن بُرائی کا
یہ جو کشکول ہے گدائی کی

صورتِ حشر ہے، قیامت ہے
ایک اِک پل تری جدائی کا

دیکھ کر اُن کو ہو گئے گمراہ
جن کو دعویٰ تھا پارسائی کا

نفسا نفسی کا یہ زمانہ ہے
اب کہاں دور آشنائی کا

باز رہتا ہوں میں محبت سے
خوف رہتا ہے جگ ہنسائی کا

اُس سے بھی بڑھ کے میں نے اُس کو دیا
جتنا حصہ تھا میرے بھائی کا

کہیں ترتیبِ وقت میں شیدؔا
کوئی لمحہ نہیں رہائی کا

غزل

صورتِ آئینہ ٹوٹ جاتا ہوں
داغ سینے کے جب مٹاتا ہوں

جلنے لگتی ہے ایک شمع نئی
یاد کی شمع جب بُجھاتا ہوں

اب یہی سوچتا ہوں روز و شب
کیا کبھی میں بھی مسکراتا ہوں

جب مجھے اِک نظر وہ دیکھتے ہیں
خود ہی، میں کِتنا پھول جاتا ہوں

کاٹ لیتی ہے راستہ دنیا
اُس طرف جب قدم اُٹھاتا ہوں

جمع کرتا ہوں زخم فرقت کے
اور پھر ضبط آزماتا ہوں

خون جلاتا ہوں رات بھر شیدؔا
شبِ فرقت کو جگمگاتا ہوں

غزل

کبھی ایسی خطا نہیں کرتے
ہم کسی کا بُرا نہیں کرتے

جن کے پیشِ نظر زمانہ ہو
اپنے حق میں دعا نہیں کرتے

پھول بنتا نہیں کوئی پتھر
بے وفا تو وفا نہیں کرتے

زندگی جس قدر بھی مشکل ہو
ہم کبھی التجاء نہیں کرتے

مجھ کو معلوم ہے یہاں کے لوگ
دل کی باتیں سُنا نہیں کرتے

رات بھر خوں جلانا پڑتا ہے
دیپ ایسے جلا نہیں کرتے

لوگ اھل نظر کبھی شیدؔا
پتھروں کو خدا نہیں کرتے

غزل

لاکھ چاہو مگر نہیں آتا
وقت تو لوٹ کر نہیں آتا

ٹوٹتا رہتا ہے بدن، جب تک
نوکِ نیزہ پہ سر نہیں آتا

رِزق بچوں کا جب نہ ہاتھ لگے
لوٹ کر اپنے گھر نہیں آتا

زندگی میں سمجھ نہیں آئی ہے
موت سے مجھ کو ڈر نہیں آتا

میری جانب فقط اندھیرا ہے
ورنہ سورج کدھر نہیں آتا

پیڑ خالی ہوں جو پرندوں سے
اُن پہ شیدؔا ثمر نہیں آتا

غزل

زمانہ یوں ستم گر ہو گیا ہے
ہر اِک انسان پتھر ہو گیا ہے

میری قسمت کا جو لکھا نہیں تھا
وہی میرا مقدر ہو گیا ہے

لگایا تھا جو اِک آنگن میں پودا
وہ مجھ سے بھی تناور ہو گیا ہے

غبار آلود یوں ٹھہریں فضائیں
دھواں اک ایک منظر ہو گیا ہے

مری چاہت کو ٹھکرا کر زمانہ
مرے پاؤں کی ٹھوکر ہو گیا ہے

اُنہیں کھوکر مرا تو جینا مرنا
مرے امکاں سے باہر ہو گیا ہے

خیالوں میں بسا کر اُن کو شیدؔا
حقیقت میں سخنور ہو گیا ہے

غزل

اِس قدر دھیان میں دامن کی ہواوَ رکھنا
بُغض سورج سے، چراغوں سے لگاوَ رکھنا

میں نے اِک عمر گزاری ہے تری راہوں میں
میرے آنگن میں بھی کچھ دیر پڑاوَ رکھنا

یاد ہے اب بھی مجھے پاوَں کا چھالا چھالا
وہ زمانے کا مری رہ میں الاوَ رکھنا

دل کی دھڑکن کو کسی روز مٹا ڈالے گا
تازہ ہر آن تری یاد کا گھاوَ رکھنا

آخرکار مری عزت کا موجب ہوگا
مجھ سے اُس زُودِ پشیماں کا کھنچاوَ رکھنا

ایک دو وقت کی روٹی جو میسر آئے
اِتنا احساس زمانے کے خداوَ رکھنا

دشت پڑتا ہے وہ جس سمت اُدھر بھی شیدؔا
اَبر رکھنا، کسی دریا کا کٹاوَ رکھنا

غزل

خبر نہ تھی وہ مجھے یوں بھی آزمائے گا
لگا کے زخم مرے دل پہ مسکرائے گا

بتا رہا ہے بگڑتا ہوا مزاج اُس کا
ہمیشہ کے لیے وہ مجھ کو بھول جائے گا

میں اِس لیے کُھلا دروازہ چھوڑ دیتا ہوں
مجھے یقیں ہے کبھی لوٹ کر وہ آئے گا

کوئی بتاؤ اُسے اس کا میں مقدر ہوں
نصیب کھوئے گا ، مجھ کو اگر گنوائے گا

تمہاری یاد ستائے گی سارا دن مجھ کو
ترا خیال مجھے رات بھر جگائے گا

غبار و گرد سے اَٹ جائیں گے سبھی ارماں
وہ خاک میری محبت کی یُوں اُڑائے گا

رہے گا ورنہ یونہی بے قرار دل شیدؔا
وہ جب ملے گا تو دل کو قرار آئے گا

غزل

یہ ہے کردار زمانے والا
رہ میں دیوار اُٹھانے والا

تیرے در سے کبھی خالی دامن
میں نہیں لوٹ کے جانے والا

دِن جُدائی کے گزر جائیں گے
وقت ایسا بھی ہے آنے والا

ہو گیا تلخیٔ حالات کا رزق
رزق بچوں کا کمانے والا

خوابِ خرگوش میں سویا ہوا ہے
سوئی خلقت کو جگانے والا

تازہ ہے میری حویلی میں ہُنوز
اک شجر چھاؤں لگانے والا

اب کہاں رسمِ محبت شیدؔا
اب کہاں دور پرانے والا

غزل

جو تیری آرزو میں جلتے ہیں
دیپ مرے لہو میں جلتے ہیں

ایسے غنچے بھی ہیں گلستاں میں
خواہشِ رنگ و بُو میں جلتے ہیں

اِک اندھیرا ہے اپنی محفل میں
دیپ بزمِ عدد میں جلتے ہیں

جب نکلتا ہوں میں تمہاری طرف
راستے ہاؤھو میں جلتے ہیں

ہم کو جلنے کا کوئی شوق نہیں
اِک تری جستجو میں جلتے ہیں

ہم وہی خستہ حال ہیں شیداؔ
جو سدا آرزو میں جلتے ہیں

غزل

دل نے یونہی نہیں دہائی کی
یار لوگوں نے بے وفائی کی

ایک انسان ہے مری خواہش
آرزو کچھ نہیں خدائی کی

اُس کا دامن بھی داغدار ملا
دھوم تھی جس کی پارسائی کی

اپنی قسمت ہے قید تنہائی
کوئی صورت نہیں رہائی کی

اُس نے باندھی ہیں تہمتیں اکثر
میں نے جس شخص سے بھلائی کی

رنج ٹوٹے ہیں جان پر شیدؔا
دل نے لیکن نہیں دہائی کی

غزل

ایسے بگڑی ہوئی تقدیر بنائی ہوئی ہے
عاشقی پاؤں کی زنجیر بنائی ہوئی ہے

مجھ کو معلوم ہے بس اپنی ضرورت کے لیے
ہر جگہ صورتِ تعمیر بنائی ہوئی ہے

دشمنِ جاں نے بہت زور لگایا ہے مگر
میرے اللہ نے توقیر بنائی ہوئی ہے

دُھل گئے داغ سبھی دامنِ ہستی کے مرے
ایسی اِک صورتِ تنویر بنائی ہوئی ہے

اِس لیے اب بھی سلامت ہے مرے تصور میں
خونِ دل سے تری تصویر بنائی ہوئی ہے

ڈھال کر اشکِ تمنّا کو لہو میں شیدؔا
میں نے بگڑی ہوئی تقدیر بنائی ہوئی ہے

غزل

ایک ایسا خیال آنکھ میں ہے
کوئی جگنو مثال آنکھ میں ہے

نشہ طاری ہے اِک عجب مجھ پر
جب سے وہ خوش خصال آنکھ میں ہے

سارے ارمان کِھلے کِھلے سے ہیں
کوئی خوشبو مثال آنکھ میں ہے

تجھ سے ملنے کی تجھ کو پانے کی
آرزو کال کال آنکھ میں ہے

سبز چولہ ہے ہر تمنا کا
ایسا رنگ وصال آنکھ میں ہے

ایک اُس شخص کے لیے شیدؔا
دل کی دھڑکن بحال آنکھ میں ہے

غزل

ہو کے مجبور زندگانی سے
ربط رکھا جہانِ فانی سے

اکثر اوقات خوف آتا ہے
اپنے سانسوں کی اس روانی سے

جسم پتھر کی سِل نہ بن جائے
ہر گھڑی پل کی رائیگانی سے

مدعا دل کا مر گیا دل میں
میری ہر پل کی بے زبانی سے

باز آتی نہیں کبھی دنیا
بدزبانی، غلط بیانی سے

دُور رکھا ہے وقت نے شیداؔ
میرے کردار کو کہانی سے

غزل

یہ حادثہ بھی سرِ رہ گزار ہونا تھا
ہمارے طلب کو غبار ہونا تھا

ہمارے بس میں نہیں تھیں ضرورتیں اپنی
امیرِ شہر کو پروردگار ہونا تھا

ترے بغیر نظر میں نہ جچ سکا کوئی
دل و نظر کو ترا اعتبار ہونا تھا

ہمارے ہاتھوں کو حسرت نے باندھ رکھا ہے
ہم ایسے لوگوں کو بے اختیار ہونا تھا

اِس یقین پہ ترے در پہ آگیا میں بھی
ترے غلاموں میں میرا شمار ہونا تھا

چھڑک رہا ہوں جو شاخوں پہ میں لہو شیدؔا
کبھی یہ موسمِ صرصر، بہار ہونا تھا

غزل

عجب اِک خوف سا پھیلا ہوا ہے
رگوں میں سانس تک اٹکا ہوا ہے

کسی کی یاد کا لمحہ نظر میں
زمانوں کی طرح پھیلا ہوا ہے

وہیں پہ چھوڑ آیا ہوں میں چہرہ
جہاں پر آئینہ بکھرا ہوا ہے

جہاں رکھی ہوئی ہے دل کی دھڑکن
ترا غم بھی وہیں رکھا ہوا ہے

جہاں کی آنکھ میں شہتیر جیسا
ہماری آنکھ کا تنکا ہوا ہے

زمانہ ہو گیا شاخوں پہ شیدؔا
ہمارا مرثیہ لکھا ہوا ہے

غزل

وہ قریبی تھا، اب بس قریب ہے
چاہت کا وہ خدا تھا کبھی، اب غریب ہے

اپنا بنایا ہے اُس نے جدائی کے واسطے
کس کو سناؤں، داستاں میری عجیب ہے

میری نظر اُتارتی ہے، روز عاشقی
اپنی نظر سے روز گراتا رقیب ہے

اپنا بنا کے رکھ لیا، ہونے نہیں دیا
اعزاز ہے یہ کچھ تو کہو یا صلیب ہے

تجھ سے چرند اچھے ہیں جن کا جہان میں
کوئی رقیب ہے نہ کوئی بھی حبیب ہے

اپنا مرض رہا ہے ہمیشہ ہی لا علاج
یُوں تو ہر اِک مرضی کا میسّر طبیب ہے

ہر دم، ہمیشہ شیدؔا میاں خوش رہا کرو
جس حال میں بھی ہو یہی تیرا نصیب ہے

غزل

لاکھ وہ مجھ سے بدگمان رہا
میں سدا اُس پہ مہربان رہا

راس آئی نہ پر زمین مجھے
مجھ سے برہم وہ آسمان رہا

تیرے ہر غم کو اپنا غم جانا
پھر بھی تُو مجھ سے بدگمان رہا

میں نے وہ وقت بھی گزارہ ہے
میں طبیعت میں سائبان رہا

دامن عشق ہاتھ میں رکھا
اور عبرت کا اِک نشان رہا

اِس جہانِ ستم میں اے شیدؔا
ہر نفس مَیں شکستہ جان رہا

غزل

آنکھیں نہیں ملتیں کبھی چہرہ نہیں ملتا
مت پوچھ شبِ ہجر میں کیا کیا نہیں ملتا

جس کے لیے میں خود سے بھی برہم رہا اکثر
بس اُس کے ستارے سے ستارہ نہیں ملتا

اِک عمر ہوئی دارو رسن خاک ہوئے ہیں
دیوانوں کا اب کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا

آنسو ہیں کہ آنکھوں سے کبھی تھمتے نہیں ہیں
اِک لمحہ سکونِ دل تازہ نہیں ملتا

برسوں سے جسے ڈھونڈتا پھرتا ہوں مسلسل
اِک اُس کا مجھے نقشِ کفِ. پا نہیں ملتا

ہے اب بھی کسک سینے میں چاہت کی برابر
پہلا سا مگر شیداؔ ارادہ نہیں ملتا

غزل

لمحہ لمحہ پلک پلک تازہ
زخم دیتا رہا فلک تازہ

اور ہم اپنی جاں پہ کھیل گئے
پھر بھی اُس کا رہا ہے شک تازہ

آگئی کوئی بھولی بسری یاد
آگئی سینے میں دھڑک تازہ

شاخِ اُمید سبز ہونے لگی
غنچہ غنچہ اُٹھی مہک تازہ

بام پر چاند جگمگانے لگا
آگئی آنکھ میں چمک تازہ

دھڑکنوں میں دھمال شیدؔا پڑی
دل میں جاگی کوئی کسک تازہ

غزل

بپا ہے حشر سا اِک آسمان پر
میں باقی ہوں ابھی لوح جہان پر

جہاں تک سرد تھا جذبہ جنوں کا
قدم جمتے نہ تھے ریگِ رواں پر

اگرچہ سنگدل ہے، بے وفا ہے
بھروسہ اب بھی ہے میرا جہاں پر

ہمیشہ اُنگلیاں اُٹھی ہیں جاناں
محبت پر، وفا کی داستاں پر

نہ پوچھ درد ہائے دل کے ہاتھوں
پڑا ہے بوجھ کتنا میری جاں پر

کیا جانا ہمیشہ دل کا شیدا
نظر اپنی رہی عشقِ بتاں پر

غزل

جس دن سے روبرو ترا چہرہ نہیں ہوا
اِک عمر ہو گئی ہے اُجالا نہیں ہوا

دنیا کے درد ہم نے فراموش کر دیۓ
ہم سے کسی طرح بھی ایسا نہیں ہوا

جیسا اُسے جہاں نے ڈھالا وہ ڈھل گیا
میں چاہتا تھا جس طرح ویسا نہیں ہوا

رہتا ہے اِک ہجومِ غمِ جاں جگر کے پاس
میں تو اکیلا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوا

اک عمر غم کی آنچ پہ سُلگائی چشمِ غم
اِس پر بھی کوئی اشک ستارا نہیں ہوا

شیداؔ تمام عمر ہی وحشت میں کٹ گئی
اِک لمحہ بھی حیات کا اچھا نہیں ہوا

غزل

گمان یونہی نہیں ہے خیال یونہی نہیں
دل و نگاہ میں رقصاں ملال یونہی نہیں

میں ڈھونڈ لایا ہوں تیرا خیال تیری طلب
رگوں میں سانس ابھی تک بحال یونہی نہیں

ہمیشہ شعر میں ڈھالا ترے تصور کو
مرا سخن مرا فن باکمال یونہی نہیں

جدھر بھی دیکھوں تری آرزو برابر ہے
نفس نفس میں بلا کا اُبال یونہی نہیں

ہر ایک درد کو سہتا ہے مسکراتے ہوئے
یہ عشق حوصلہ میں بے مثال یونہی نہیں

میں تیرے غم میں ہوں مدّت سے مبتلا شیدؔا
مرا یہ جینا مری جاں محال یونہی نہیں

غزل

تلخ جینے کا یوں حصول کیا
بے وفا شخص کو قبول کیا

اپنے حصے کا پھول بھی میں نے
عشق کے کھیل میں ببُول کیا

پتھروں جیسے اِس زمانے میں
کاروبارِ وفا فضول کیا

دے کے آسودگی زمانے کو
صرف بدلے میں غم وصول کیا

راہِ اُلفت کی اِس مسافت میں
جسم سارا ہی دُھول دُھول کیا

شیدؔا اِس بے وفا جہاں کے لیے
صورتِ خار پھول پھول کیا

غزل

دل کم بخت کی نادانی سے
آنکھ دو چار ہے پانی سے

حَبس ایسا شبِ ہجراں میں ہوا
سانس آتا نہیں آسانی سے

اِک عجب خوف ہے رقصاں گھر میں
درو دیوار کی ویرانی سے

لوگ ایسے بھی بدل جاتے ہیں
دیکھتا ہوں اُسے حیرانی سے

میں ہوں درویش صِفت دوست مجھے
کیا غرض خلقتِ سلطانی سے

ہاتھ آتی نہیں منزل شیدآ
حالتِ بے سرو سامانی میں

غزل

دھوپ دنیا کو مگر لگتا ہے
مجھ کو جو شخص شجر لگتا ہے

اب بھٹکنا ہے مقدر اپنا
ہر نفس زیرِ سفر لگتا ہے

دل کوئی پیڑ نہیں ہے لیکن
اِس کی شاخوں پہ ثمر لگتا ہے

سُنتِ قیسؔ ہے مذہب میرا
اب مجھے دَشت بھی گھر لگتا ہے

مُندمِل جب بھی ہوا زخم کوئی
جا کے دیوار سے سر لگتا ہے

جس طرف دشمنِ جاں ہے شیداؔ
میرا دشمن بھی اُدھر لگتا ہے

غزل

جب تری آرزو کو مار لیا
جو نہ کٹتا تھا پل گذار لیا

لمحہ وصل کی تمنّا میں......
کتنی صدیوں کا انتظار لیا

دشمنوں کو پُکار کر دیکھوں
دوستوں کو بہت پکار لیا

لوگ پھولوں کی سمت مائل تھے
میں نے کانٹوں کا ایک ہار لیا

جب جہاں نے جبیں کشادہ کی
خود کو تھوڑا بہت سنوار لیا

ہم نے ترتیب وقت سے شیداؔ
کب کوئی لمحۂ بہار لیا

غزل

خامشی کو زبان نہیں پایا
جب سے اپنا نشاں نہیں پایا

جس کی میں آخری تمنّا تھا
اُس کو بھی مہرباں نہیں پایا

رُک گیا ہوں، ترے تصور کو
ساتھ اپنے جہاں نہیں پایا

جب سے گھیرا ہے دشمنوں نے مجھے
تیر زیرِ کماں نہیں پایا

ایسے اُمید کے چراغ بُجھے
کسی جانب دھواں نہیں پایا

وہ جو ہوتے تھے جانِ جاں شیدآ
اُن کو بھی جانِ جاں نہیں پایا

غزل

یہ بھی نہیں کہ مجھ کو خسارا نہیں ہوا
دنیا کے ساتھ پھر بھی گذارا نہیں ہوا

رکھا ہے خود پہ طاری غمِ شب کا اِضطراب
جب تک چراغِ ذات ستارا نہیں ہوا

ہر بار یہ ہوا ہے اپنا ضروری کام
آدھا نہیں ہوا کبھی سارا نہیں ہوا

جاگی ہے جب سے کچے گھڑے کی اِک آرزو
اپنا نصیب کوئی کنارا نہیں رہا

اِک عمر ہو گئی ہے نظر ڈُھلے ہوئے
اُس چاند کا کبھی بھی نظارہ نہیں ہوا

شیداؔ میں منتظر ہوں بڑی دیر سے یہاں
لیکن اُدھر سے کوئی اشارہ نہیں ہوا

غزل

روز و شب ہاتھ پاؤں مارتا ہوں
زندگی اِس طرح گزارتا ہوں

دھڑکنیں شور کرنے لگتی ہیں
جب بھی دِل سے اُسے اُتارتا ہوں

اپنی تنہائیوں سے گھبرا کر
تجھ کو بے ساختہ پکارتا ہوں

جب بھی ملتی ہے دسترس خود پر
اپنے اندر کی مَیں کو مارتا ہوں

تجھ کو کیا علم میں شبِ غم میں
کیسے امکان کو سنوارتا ہوں

دھڑکنِ دل میں آج بھی شیداؔ
جذبۂ دوستی اُبھارتا ہوں

غزل

کبھی تھا اب مگر ایسا نہیں ہے
ترا رستہ مرا رستہ نہیں ہے

پریشان حال بیٹھے ہیں پرندے
کسی بھی پیڑ پر پتا نہیں ہے

ہُوا ہے حال جو ہم اہلِ دل کا
کسی کا حال یوں ہوتا نہیں ہے

کھلا ہے یہ جہاں کی ہمرہی میں
کوئی بھی شخص اب اچھا نہیں ہے

ڈھلے گی کس طرح اب شامِ فرقت
لہو سے بھی دیا جلتا نہیں ہے

یہ جینا بھی کوئی جینا نہیں شیداؔ
کسی نے آج تک سوچا نہیں ہے

غزل

مناظر سے لہو جاری نہیں تھا
کوئی موسم یہاں بھاری نہیں تھا

بنا منزل کی جب ڈالی گئی تھی
کسی کو زعمِ سالاری نہیں تھا

قدم ہجرت سے خالی ہو رہے تھے
پر آنگن غیر معیاری نہیں تھا

سخن تھا عین فطرت کے مطابق
کوئی مضمون اخباری نہیں تھا

سراپا چاند تھا بامِ تمنّا
مرا سورج بھی سرکاری نہیں تھا

مجھے بھی خاک سے نسبت تھی شیدؔا
اُسے بھی شوقِ سرداری نہیں تھا

غزل

دکھائی دیتے ہیں کانٹے بھی پھول دامن کے
اگر لباس میں رکھیں اُصول دامن کے

ہر ایک شخص یہاں کسی کے حصار میں ہے
یہاں کے لوگ ہیں سب بے اُصول دامن ہے

کوئی دعا کبھی خالی پلٹ نہیں سکتی
نگاہ میں ہوں اگر عرض و طول دامن کے

وہ نوچ لیں گے بدن سے کفن تلک اپنا
کیے نہ قرض جو ہم نے وصول دامن کے

بُرا کیا ہے بہا کر لہو تمنّا کا
یہ داغ دھوئے ہیں ہم نے فضول دامن کے

وہی جو بھیک میں شیدؔا قبول ہم نے کیے
بنے ہیں آج وہ سکّے ببُول دامن کے

غزل

یہ روشنی ترے غم کی گنوا نہیں سکتا
میں تیری یاد کے جگنو بُجھا نہیں سکتا

مجھے خبر ہے اگر تُو بھی اِتنا جانتا ہے
تجھے میں بھول کے جیون بِتا نہیں سکتا

زمینِ زاد ہوں میں اِس قدر خیال رہے
ستارے توڑ کے اِس پار لا نہیں سکتا

اگرچہ تجھ سے محبت ہے انتہائی مجھے
فصِیل اپنی اناء کی گرا نہیں سکتا

وہ دن جو میں نے گزارے ہیں تیری قربت میں
ہزار چاہوں بھی اُن کو بھلا نہیں سکتا

ضیا اُنہی کے سبب سے تمام تر ہے یہاں
میں دل کے زخموں کو شیداؔ بُجھا نہیں سکتا

غزل

فصیلِ شام پر آنکھیں سجاکر
مْیں زندہ ہوں لہو دل کا جلاکر

تمہارا راستے میں منتظر ہوں
گزرتا ہے جہاں، ٹھوکر لگاکر

کوئی تازہ ہوا کا ایک جھونکا
پلٹ جاتا ہے میرے در پہ آکر

تری جانب پلٹ جاتا ہوں اکثر
میں اپنا ہاتھ دنیا سے چُھڑاکر

بکھرنے کو ہے میرا جسم سارا
شکستہ رُوح پر ٹھوکر لگاکر

مجھے شیدآ بہت جلنا پڑا ہے
جگر کا خون چراغوں میں جلاکر

غزل

پھول سے خار کی مانند بنایا ہے مجھے
اُس نے اِس بار نظر سے یُوں گرایا ہے مجھے

ڈھال کر دردِ دلِ راز میں پیکر میرا
میرے نقاش نے اِس طرح بنایا ہے مجھے

آج بھی نقش ہے پلکوں پہ برابر میری
خواب اس عشق نے جو جو بھی دکھایا ہے مجھے

کوئی بے کار سی شئے ہوتی ہے جیسے صاحب
اِس قدر اُس نے حقارت سے گنوایا ہے مجھے

یہ الگ بات کہ اِک روگ بنا ہے جاں کا
خوابِ غفلت سے اسیِ غم نے جگایا ہے مجھے

کھینچ لایا ہے جنُوں دشت کی جانب شیدؔا
شِدتِ دھوپ بھی اک پیڑ کا سایہ ہے مجھے

غزل

جب تک کہ اِس کی زلف سنواری نہ جائے گی
ایسے تو زندگی یہ گزاری نہ جائے گی

اِتنی خبر کہاں، تیرے درد کی یہ دھوپ
پھیلے گی سر پہ ایسے، اتاری نہ جائے گی

کرنے لگا ہے عشق تقاضے عجب عجب
بازی اناء کی مجھ سے تو ہاری نہ جائے گی

دنیا ہزار راہ میں دیوار کھینچ لے
اہل دل و نگاہ سے یاری نہ جائے گی

زخمِ جگر کو چاٹ کے جیتے ہیں ہم جدھر
اُس سمت حکمراں کی سواری نہ جائے گی

شیدؔا اُبھر سکا نہ اگر آفتابِ شوق
ہم سے تو ایک شب بھی گذاری نہ جائے گی

غزل

چلتا ہوں میں جو تھام کے خوابوں کی روشنی
یہ ہے تمہارے نام کے خوابوں کی روشنی

جب بھی ڈھلی ہے صبح مرے کام آگئی
یہ روشنی، یہ شام کے خوابوں کی روشنی

رکھا ہے معتبر مجھے جس نے قدم قدم
وہ تو ہے احترام کے خوابوں کی روشنی

رکھتی ہے ضوفشاں مرے سوچوں کا بانکپن
اِک حُسنِ خوش کلام کے خوابوں کی روشنی

ہر لحظہ آفتاب میں رکھتی ہے ڈھال کر
اُس جگمگاتے بام کے خوابوں کی روشنی

رکھتی ہے شیدؔا آنکھ کے پردوں کو خوش نما
اُس پائے خوش خرام کے خوابوں کی روشنی

غزل

ہمیشہ ضبط کو میں ایسے آزماتا ہوں
جلے نہ دیپ تو اُس میں لہو جلاتا ہوں

عجیب آبلے میرے پیروں میں پڑنے لگتے ہیں
قدم تمہاری طرف جب بھی میں اُٹھاتا ہوں

میں جمع کرتا ہوں اپنی رگوں میں خونِ جگر
پھر اُس کے بعد شبِ غم میں پھیل جاتا ہوں

یقیں میں ڈھال کے سورج کی ایک ایک کرن
فصیلِ شامِ تمنا پہ جگمگاتا ہوں

جہاں بھی اُن کی جبیں پر شِکن ابھرتی ہے
میں ریزہ ریزہ بکھرتا ہوں ٹوٹ جاتا ہوں

بنا دیا ہے محبت نے اِس طرح شیداؔ
ذرا سی ٹھیس بھی لگتی ہے ٹوٹ جاتا ہوں

غزل

ہو ادا ہم سے با وضو آمین
سجدۂ شوقِ آرزو آمین

پھر دعائیں قبول ہوں گی مری
جس گھڑی کہہ اُٹھے گا تُو آمین

مسکراہٹ پلٹ کے آجائے
ختم ہو اپنی ہاؤ ہو آمین

عزتِ نفس پر نہ آنچ آئے
سب کی قائم ہو آبرو آمین

راستے منزلوں کے کُھل جائیں
رنگ لائے یہ جستجو آمین

اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو
پیار کا، امن کا عدو آمین

اِس محبت کے کھیل میں شیدؔا
ہم بھی ہو جائیں سرخرو آمین

غزل

کوئی صورت اب بہر صورت بنانا چاہیے
جنگ کے ایندھن سے دنیا کو بچانا چاہیے

گردنِ مظلوم پہ خنجر رہے گا کب تلک
ظالموں کا سر بہر صورت جھکانا چاہیے

کہہ رہا ہے وقت ہم سے پھینک کر اپنا قلم
تیر اُٹھانا چاہیے، تلوار اُٹھانا چاہیے

دوستو جکڑا ہوا ہے جس نے برسوں سے ہمیں
اُس حصارِ ظلم کو اب ٹوٹ جانا چاہیے

غم کے مارو ہے اِسی میں صرف اپنی عافیت
اب بغاوت کا عَلَم ہم کو اُٹھانا چاہیے

زیرہ زیرہ ہم بکھر جائیں گے پتوں کی طرح
ایک مرکز پر ہمیں اب لوٹ آنا چاہیے

آ بھی سکتا ہے یہاں شیدؔا کوئی انقلاب
شرط ہے اِتنی، ضمیروں کو جگانا چاہیے

غزل

خود کو گرتے ہوئے سنبھالا جائے
ایسا رستہ کوئی نکالا جائے

جس طرف سر اُٹھا ہے ظالم کا
کوئی پتھر اُدھر اُچھالا جائے

گُھل بھی سکتے ہیں خدوخالِ ستم
ظلم کو آئینے میں ڈھالا جائے

شب بے نور ڈھل بھی سکتی ہے
اپنا اپنا دیا اُجالا جائے

اپنے سینوں میں اب ضروری ہے
جذبۂ حُریت کو پالا جائے

ہم کوئی پھول ہیں کہ پتھر ہیں
اپنے احساس کو کھنگالا جائے

اِن سُلگتے ہوئے چراغوں میں
اب لہو شیدؔا دِل کا ڈالا جائے

غزل

بات جو پیار کی سمجھتے ہیں
وہ زباں دار کی سمجھتے ہیں

سر کو کچھ بھی نہیں سمجھتے جو
قدر دستار کی سمجھتے ہیں

میں سمجھتا ہوں، صرف اہلِ ستم
بات تلوار کی سمجھتے ہیں

کب یہ ریشم کے پیرھن والے
دامنِ تار کی سمجھتے ہیں

زندگی کو سدا امانت ہم
اپنے دلدار کی سمجھتے ہیں

ربط جن کا ہے پنچھیوں سے وہ لوگ
بات اشجار کی سمجھتے ہیں

سرخمیدہ ہوں جس گھڑی شیدؔا
وہ گھڑی ہار کی سمجھتے ہیں

غزل

داستاں ایسی اب رقم کر دیں
تار ہم دامنِ ستم کر دیں

دَشنہ، خنجر بنائیں لفظوں کو
صورتِ تیغ اب قلم کر دیں

زخم دامن کے سب اُلٹ ڈالیں
اور گریبان کو علم کر دیں

باندھ لیں دوستو کمر اپنی
رونے دھونے کی بات کم کر دیں

جو کسی سے بھی ہو نہیں پایا
کیوں نہ محشر بپا وہ ہم کر دیں

کاٹ ڈالیں یہ سامراجی ہاتھ
آؤ ظالم کا سر قلم کر دیں

ہر نفس سُورۃ کا
اپنے سینے پہ شیدؔا دم کر دیں

غزل

اب یہی دل میں ایک ٹھانی ہے
یہ فصیلِ سِتم گِرانی ہے

ڈھل بھی سکتی تھی شامِ غم میری
کب زمانے نے بات مانی ہے

مر رہی ہے حیات فاقوں سے
اِس غضب کی یہاں گرانی ہے

خاک ہو جائیں گے یہ تاج و تخت
ایسی ساعت ضرور آنی ہے

اب کے شیدؔا یہ ظلم کی بستی
پیار اور امن سے بسانی ہے

غزل

بے وفا ایک دن یہ ہونا ہے
تو نے سر کو پکڑ کے رونا ہے

اپنا بستر رہے یہ زمین کی خاک
سایۂ آسماں بچھونا ہے

جس سے زندان بھی مہک اُٹھے
ہار پھولوں کا وہ پرونا ہے

ظلم سہنا، ستم پہ چُپ رہنا
یہ تو اپنی اناء کو کھونا ہے

اپنے گھر کا یہ مٹی، گارا بھی
مجھ کو چاندی ہے مجھ کو سونا ہے

بیعتِ ظلم کو گوارہ کروں
یہ ہُوا ہے نہ مجھ سے ہونا ہے

صورتِ آفتاب ہوں شیدآ
چاند میرے لیے کھلونا ہے

غزل

مُونس و غم گُسار ہیں میرے
آپ تو یارِ غار ہیں میرے

اِک فقط آپ ہی بھروسہ ہیں
آپ ہی اعتبار ہیں میرے

وہ مجھے کیسے بھول سکتے ہیں
وہ تو بچپن کے یار ہیں میرے

کرچی کرچی بکھر رہا ہوں میں
عکس سب بے قرار ہیں میرے

سارے محشر بھی میرے اپنے ہیں
یہ سبھی انتشار ہیں، میرے

کارِ تخلیق میں یہ لیل و نہار
کس قدر سازگار ہیں میرے

کیا زمیں اور کیا فلک شیدؔا
سارے خدمت گزار ہیں میرے

غزل

بے خبری میں بھی، خبر تو ہے
دل پہ بوجھ نہ سہی، جبر تو ہے

تیرے میرے بیچ کوئی شرط نہیں
مگر اِک لفظ "اگر" تو ہے!

مانا کہ جُدائی اچھا لفظ نہیں
ہاں اک لفظ "مفر" تو ہے

زندگی ٹھہر سی گئی تیرے بِن
مگر زندگی اِک سفر تو ہے

ہُوں نہ آقاؐ کے سامنے رُسوا
بس اِک اِسی بات کا ڈر تو ہے

آگہی کا دیا جہاں پہ روشن ہے
دل کے اندر بھی ایک گھر تو ہے

خوف کیا بے گھری کا ہو شیداؔ
آخر گھر اپنا قبر تو ہے

غزل

اب کے وہ حشر ہم اُٹھا دیں گے
ہر سِتم خاک میں ملا دیں گے

چھین لیں گے یہ تخت و تاج تیرے
قصرِ شاہی ترا ہلا دیں گے

دیکھنا ایک دن ستائے لوگ
تیرے گھر بار کو جلا دیں گے

صحنِ مُفلس میں ٹمٹماتے دیئے
تیرے خورشید کو بجھا دیں گے

توڑ کر خوف کے سبھی تالے
جو بھی سچ ہے وہ ہم بتا دیں گے

شور اُٹھے گا ایک اِک گھر سے
ہم بغاوت کو وہ ہوا دیں گے

جس سے جو بھی خطا ہُوئی شیدؔا
اُس خطا کی اُسے سزا دیں گے

غزل

اب کے یُوں اپنا سر اُٹھاکے چلیں
تارِ دامن، علم بنا کے چلیں

جو بھی رستے کی اب بنے دیوار
اُس کو ٹھوکر ذرا لگا کر چلیں

ساتھ رکھیں لوؤں چراغوں کی
اور لَو میں جگمگا کے چلیں

بھیڑ آلام کی بکھر جائے
اِتنی شدت سے مسکراکے چلیں

حق کے رستے پہ گر نکلنا ہے
ضبط کو اپنے آزما کے چلیں

درد کی رہ گزر سمٹ جائے
گر قدم سے قدم ملاکے چلیں

وقت شیداؔ یہ کہہ رہا ہے ہمیں
سر سے اُونچے علم اُٹھاکے چلیں

غزل

کیا کہوں کیا عہد میرا ہے
زخم خوردہ بہت سویرا ہے

معترف میرے رزق پر ہو کیا
آسماں پر میرا بسیرا ہے

تیری شاھی میں دشمنوں نے ہمیں
آج چاروں طرف سے گھیرا ہے

اپنے گھر بار سب اُجڑ گئے ہیں
دائم آباد تیرا ڈیرہ ہے

ہل چلاتا ہوں میں زمینوں میں
اور سارا اناج تیرا ہے

پاؤں منزل پر کیا پڑیں اپنے
اپنا اپنا جب لٹیرا ہے

کون ایسا ہے اپنا شیدؔا
کس نے طوفان کے رُخ کو پھیرا ہے

غزل

وہ نہ آئے تو اُن کی یاد آئی
جن کا شیدؔا ہوا ہے شیدائی

بحرِ اُلفت سے ڈر نہیں لگتا
میں نے دیکھی ہے اِس کی گہرائی

اُن کو دیکھا ہے جب سے بے پردہ
میری بڑھنے لگی ہے بینائی

اُن کی محفل نے کر دیا پاگل
اب تو ڈسنے لگی ہے تنہائی

ہوش باقی نہیں رہے میرے
اُس نے آنکھوں سے اِتنی پلوائی

یہ تماشا بھی خوب ہے شیدؔا
اُن کی شہرت ہے میری رُسوائی

غزل

اے مرے شاہا ترے دربار میں
سر نہیں کوئی کسی دستار میں

کھو دیا جو لمحۂ مصروف کو
عمر گذری عرصۂ بے کار میں

زندگی اب بھی بسر ہوتی ہے یوں
آدمی رہتا ہو جیسے غار میں

سربلندی کا شرف مجھ کو ملا
سر کٹا کر ظلم کے دربار میں

تا ابد زندہ رہے گی شاعری
میرؔ کا درد ہے مرے اشعار میں

وہ جو شیداؔ راہ میں حائل رہی
در بنایا ہے اُسی دیوار میں

غزل

زخم سینے کے جبینوں پہ عیاں ہونے میں
آبرو عشق کی قائم ہے، زیاں ہونے میں

ہمت مرداں سے آتی ہے خدا کی اِمداد
دیر لگتی نہیں تنکے کو مکاں ہونے میں

دوست خاموش سی آنکھیں جو ذرا بول پڑیں
وقت لگتا نہیں پھر راز عیاں ہونے میں

برہمی اُن کی مجھے راس ہے اب آئی ہوئی
اب تو آتا ہے مزہ اشک رواں ہونے میں

ہم بھی کچھ دیپ یہاں دوست جلا لیں لیکن
دیر کب لگتی ہے شمعوں کو دھواں ہونے میں

ہم بھی اپنے تھے بہت اُن کے کسی وقت مگر
دیر لگتی نہیں پھر ہم کو فلاں ہونے میں

جو جگہ تم نے بنالی ہے دلوں میں شیدؔا
کچھ نہیں جاتا ترا اب تو فغاں ہونے میں

غزل

بعد از ہجر بھی جُدا نہ ہوا
معتبر ہو کے ناخدا نہ ہوا

حق بہت ہی ادا کیا لیکن
اِس محبت کا حق ادا نہ ہوا

گُوندھ کے مٹی شاہکار کیا
فن یہ شاہکار کو روا نہ ہوا

اُس کی منشاء تھی. اِک نئی دنیا
مجھ سے ایسا مگر ہوا نہ ہوا

دیکھ لیتا وہ مُسکرا کے کبھی
اُس کو اِتنا بھی حوصلہ نہ ہوا

میں محبت کا داعی ہوں مجھ سے
دشمنِ جاں کا بھی بُرا نہ ہوا

درد شیدؔا ہے یہ جہاں کو فقط
میں کہ آمادۂ ریا نہ ہوا

غزل

دشتِ حسرت گزار آئے ہم
زِیست کے خم سنوار آئے ہم

گزرے پل پھر گزار آئے ہم
غم پُرانے نکھار آئے ہم

اُس کو ڈھونڈا چمن چمن ہم نے
صحرا صحرا پکار آئے ہم

درو دیوار تھے وہی گلیاں
صدقہ اُنکا اُتار آئے ہم

قُرب یزداں کا مِل گیا ہم کو
جس گھڑی میں کو مار آئے ہم

اُس گلی میں اناء نہ جانے دے
جب گئے اشکبار آئے ہم

بے خودی یہ تھی ہم خودی کے لیے
خود بخود سوئے دار آئے ہم

جب بھی آئے ہیں سجدہ گہہ کی طرف
محوِ امکانِ یار آئے ہم

جب اذانِ عشق کی سنائی دی
سر کے بل سُوئے یار آئے ہم

جب سپردِ خدا کیا خود کو
دل سے سب ڈر اُتار آئے ہم

شیدؔا ساحل سے دُور، بیچ بھنور
خواہشِ زِیست اُتار آئے ہم

غزل

کھویا ہے اُس نے مجھ کو کسی اور کے لیے
روتا ہوں اِس طریقے پر اِس طور کے لیے

ٹالا بہت ہی وصل نے اِس ہجر کو مگر
ہر بار ضِد رہی اُسے فی الفور کے لیے

وہ شخص محوِ خواب تھا اونچی اڑان تھی
فرصت ہی کب اُسے تھی ذرا غور کے لیے

چاہا تھا اُس نے ایسا دمِ ہجر مجھ سے دوست
میں کہ بنوں مثال کسی دور کے لیے

شیداؔ بہت ہی اُس کی ہے مسماریوں کا دُکھ
رہتا پریشان حال ہوں کے لیے

غزل

وہ جو حرف حرف اُجال دے
مجھے فن میں ایسا کمال دے

میں چراغِ صبحِ نوید ہوں
مجھے ظلمتوں سے نکال دے

کوئی ایسا معرکہ سر کروں
یہ زمانہ میری مثال دے

میں بھٹک گیا ہوں اِدھر اُدھر
مجھے میری سمت اُچھال دے

یہ جو وسوسے ہیں، جو وہم ہیں
مرے دِل سے مولا نکال دے

تُو جو چاہے آنکھ جھپکتے ہی
مجھے موجِ درد اُچھال دے

مجھے شیداؔ بس یہی ڈر ہے اب
کہیں کل کے وعدے پہ ٹال دے

غزل

عشق کہانی بہت پرانی
کہیں رکاوٹ کہیں روانی

میرے لئے قولِ فصیل
اُس کے لئے بات زبانی

ایک وہی مانوس سا چہرہ
اک صورت جانی پہچانی

جیون اک دشوار سفر ہے
عشق کی منزل مشکل پانی

عشق میں ہم نے اتنا سیکھا
عشق حقیقت زیست کہانی

بے رُخیوں کی دُھند بہت ہے
شکل نہیں جاتی پہچانی

شیدؔا نام فدا ہونے کا
تونے پر یہ بات نہ جانی

یاداشت

یاداشت

یاداشت

یاداشت

تصانیفِ مُصنّف

دَشتِ شب (اردو غزلیات)

خاموش محبت (افسانہ)

گمانِ یقیں (اردو غزلیات)

حقیقتِ لاہور (تاریخِ لاہور پر تحقیق)

قلم گَرد (کھری کھری باتیں)

پیا مِلن کی آس (ڈرامہ)

حَرف شناس (منتخب کالم)

خاصاں دِی گَل (مجموعہ نعت)

پانی وِچ پتاسا (پنجابی کافیاں، غزلاں، گیت)

رفُوگر (افسانہ)

رَقصِ آگہی (اردو غزلیات)

مُجاب (ناول، ڈرامہ سیریل)

سَوفیصد سچ (ہوش ربا حقائق)

چُپ دا شُور (پنجابی کافیاں، غزلاں)

جاوید شیداؔ

جاوید شیداؔ، ہمارے عہد کی ایک منفرد آواز ہے۔ اپنی دُھن میں رہنے والا، محبت کی مٹی میں گُندا ہوا، اپنے باطن کی خوش بُو کا اسیر، گوشہ نشین، تنہائی پسند، مادی اقدار سے گریزاں، روحانی اور اخلاقی اقدار کی شکست وریخت پر نوحہ کناں، انسان کی بے توقیری پر لہو رونے والا، معرفت کی اُجلی اور مُعطر راہوں کا مسافر، امید کا پیامبر، درد کی دولت سے تخلیقی توانائی حاصل کرنے والا، خوابوں کے گلشن سے آرزوؤں کے گلاب چُننے والا، شعر کی حرمت کا رکھوالا، رقصِ آگہی کا خوگر، بحرِ مُحبت کا شناور، زمینی حقائق کا فہم رکھنے والا، کلمۂ حق بلند کرنے والا، نافۂ سخن سے مشک کشید کرنے والا، زمینِ محبت کی آب یاری کرنے والا...... جاوید شیداؔ، یقیناً ایک منفرد شاعر ہے۔ چھوٹی بحروں میں بڑا شعر کہنے والے اس شاعر کے باطن میں معرفت کی کلیاں مہک رہی ہیں۔ اس شعری مجموعے کے ہر مصرعے میں آگہی کا رقص دیکھئے اور معرفت کی کلیوں سے مشامِ جاں کو مُعطر کیجئے۔

ڈاکٹر محمد کامران

پروفیسر ادارہ زبان وادبیاتِ اردو،
ڈائریکٹر ادارہ تالیف وترجمہ
یونیورسٹی آف پنجاب، پاکستان